خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ

کی

دس مختصر مجالس کا مجموعہ

گلدستۂ خطابت

ناشر

تنظیم المکاتب

گلدستۂ خطابت

ایمان۔ تقویٰ۔ صادقین، اتباع، فتح و نصرت، حیات شہید، ثقلین،
عظمت اسلام، وصیت حق و صبر کے موضوعات پر

خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ

کی

دس مختصر مجالس

ناشر

تنظیم المکاتب

گولہ گنج لکھنؤ

ٹیلی فیکس ⇐ 2615115, 2628923, 2618194

نام کتاب: گلدستۂ خطابت
مُصنِف: خطیبِ اعظم مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ
پہلا ایڈیشن: دسمبر ۱۹۹۲ء
دوسرا ایڈیشن: ستمبر ۲۰۱۰ء
تعداد: دو ہزار
مطبوعہ: امت آفسٹ، لکھنؤ
قیمت: Rs.20:00
ناشر: تنظیم المکاتب لکھنؤ ۱۸، انڈیا

فہرست مجالس

باسمہٖ سبحانہ

عرض ناشر

بانی تنظیم المکاتب خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ کی مجالس کے دو مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں، "دس مجلسیں" اور "مجالس خطیب اعظمؒ"۔ زیر نظر مجموعہ پہلی بار جناب مولانا کاظم رضا صاحب قبلہ کی جانب سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ دراصل ان مجالس کی بنیاد مولانا کاظم رضا صاحب قبلہ کے فرزند سید نثار مہدی مرحوم کی وہ مجالس ہیں جنھیں انھوں نے خود مرتب کیا تھا۔ جواں سال فرزند کی موت پر مولانا کاظم رضا صاحب قبلہ نے خطیب اعظمؒ سے فرمائش کی کہ وہ ان مجالس کو مرتب فرمادیں، چنانچہ خطیب اعظم طاب ثراہ نے خود ان مجالس کو دوبارہ مرتب کیا۔ مفاہیم کے اضافے کیے اور پانچ مزید مجالس لکھ کر دس کی تعداد مکمّل فرمائی۔

پہلی بار یہ مجالس "مجالس مہدی" کے نام سے طبع ہوئیں اور اتنی مقبول ہوئیں کہ بہت جلد ساری جلدیں ختم ہوگئیں۔ مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہی مجموعہ "گلدستۂ خطابت" کے نام سے پاکستان میں، پھر علامہ جوادی مدظلہ، کے مقدمہ کے ساتھ مذہبی دنیا الٰہ آباد سے شائع ہوا۔ افادیت اور مومنین کے مطالبے کے پیش نظر ادارہ اسے دوبارہ شائع کر رہا ہے۔

بارگاہِ احدیت میں دُعا ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؑ کے زیرِ حمایت ہم کو زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر خدمت دین کا موقع دے۔ نیز مومنین کرام کی توفیقات میں اضافہ فرمائے کہ وہ عزائے امام مظلومؑ کو وسیلہ بنا کر دین اہلبیتؑ کے استحکام میں معین و مددگار ہوں کہ یہی محبت و مودت کا تقاضا ہے، اور مجالسِ عزا اس کا سب سے موثر ذریعہ! خطیب اعظمؒ کی مجالس اس کا بہترین نمونہ بھی ہیں اور نئی نسل کے ذاکرین کے لئے مشعلِ راہ بھی!۔

والسّلام

سیّد صفی حیدر
سکریٹری تنظیم المکاتب

بسم اللہ ولہ الحمد

خطیب اعظم مولانا سیّد غلام عسکری طاب ثراہ کی ذات بابرکات سے
کون واقف نہیں ہے۔ ان کے انتقال کو دو سال گذر چکے ہیں لیکن ان کی خ
کی گونج فضاؤں میں برقرار ہے اور ان کی آواز آج بھی کانوں میں آرہی ہے
انھوں نے حالات زمانہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد خطابت کو ایک نیا رُخ د
اور فضائل و مصائب آل محمد علیہم السلام کو روایاتی انداز سے بیان کرنے
بجائے ان کی روح اور گہرائی پر زور دیا اور اس سے قوم کو مسلسل روشناس کرا
رہے۔ ان کا یہ فقرہ کسی دور میں بھلایا نہیں جا سکتا کہ :

"خیام حسینی کی تاراجی کے وقت ثانی زہراؑ کا عابد بیمار علیہ السلام
سے مسئلہ دریافت کرنا ایک ابدی سبق ہے کہ حکم شریعت دریافت
کیے بغیر قدم اُٹھانا جذباتیت ہے حسینیت نہیں ہے۔"

ان کی مختصر مجالس کا مجموعہ دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ مختصر مجالس کی دور
میں بے حد ضرورت ہے کہ ہر شخص کو ذکر اہلبیتؑ کا شوق ہے اور ماشاء اللہ مجالس
کثرت بھی ہر شخص سے تقاضا کر رہی ہے کہ وہ چند منٹ ذکر اہلبیتؑ اظہار کر دے۔

خطیبِ اعظمؒ کی یہ مختصر مجلسیں ایک نئے ذوق اور نئے انداز بیان کی نشاندہی ہیں اور ان سے نو آموز افراد میں ایک نیا جذبۂ اصلاح و بیداری پیدا ہو سکتا ہے۔ رب کریم خطیب اعظم کے درجات کو بلند فرمائے اور مومنین کرام کو اِن مجالس سے استفادہ کرنے کی توفیق کرامت فرمائے۔

والسّلام علیٰ مَن اتّبع الھُدیٰ

السیّد ذیشان حیدر جوادی
جنوری ۱۹۸۸ء

پہلی مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: "یٰاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ ۝" (سورۃ التوبۃ۔ آیت ۔۱۱۹)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اے ایمان والو! پرہیزگار بنو اور صادقین (سچوں) کے ساتھ ہو جاؤ۔"

اس آیت میں ہر صاحبِ ایمان کو دو (۲) باتوں کا حکم دیا گیا ہے:

پہلا حکم تقویٰ (پرہیزگاری) کا ہے۔

دوسرا حکم صادقین کی پیروی کا ہے۔

چونکہ یہ دونوں حکم ایمان کے بعد دئے گئے ہیں لہذا پہلے ایمان کو سمجھ لینا چاہیئے۔

ایمان تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے:

(۱) دل میں یقین (۲) زبان سے اقرار (۳) اعضاء و جوارح سے عمل۔

ان تینوں باتوں میں سب سے اہم اور بنیادی بات، دل کا یقین ہے۔ اگر دل میں

یقین نہ ہو تو زبان سے اقرار کرنا، یا عمل کرنا سب بیکار اور بے وقعت ہے کیونکہ دل میں انکار و کفر رکھ کر زبان سے اقرار کرنا، یا عمل کر کے دکھانا منافقت ہے اور سب جانتے ہیں کہ نفاق کفر سے بھی بدتر چیز کا نام ہے اور منافق کو دوزخ کے سب سے آخری درجے میں جگہ ملے گی اور سب سے زیادہ سخت عذاب منافق پر ہوگا۔

غرض کہ ایمان کے تینوں جزوں میں دل کے یقین کی سب سے زیادہ اہمیت ہے بلکہ ایمان کی بنیاد دل کا یقین ہی ہے۔ اگر کسی وقت بھی دل کا یقین انکار میں بدل جائے تو ایمان رخصت ہو جاتا ہے لیکن صرف دل کا یقین ہی کافی نہیں ہے بلکہ دل میں جو یقین ہے اُس کا زبان سے اقرار و اعلان بھی ضروری ہے اور اقرار بھی کافی نہیں ہے، جب تک اقرار کے مطابق عمل نہ کیا جائے۔

دین میں سب سے پہلے اللہ کو ماننا ہے۔ تو ضروری ہے کہ اللہ کے ہونے کا دل کو یقین ہو یعنی اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ کہنا اس یقین کا زبان سے اقرار ہے۔ یہ اقرار کلمہ کا جز ہے اور ہر اذان میں اس اقرار کا اعلان کیا جاتا ہے۔ نماز کا ہر فعل اللہ کے ماننے کا عملی اظہار ہے اسی طرح نبی و امام کا دل میں یقین رکھنا ضروری ہے اور کلمہ میں اُن کے بارے میں جو یقین ہے کہ یہ نبی اور امام ہیں ان کا اقرار کرنا بھی واجب ہے ان پر صلوات پڑھنا، ان سے محبّت کرنا، ان کی تعظیم کرنا، ان کے دشمنوں سے بیزاری اختیار کرنا، اُن کے احکام پر عمل کرنا، ان پر ایمان لانے کے بعد، اس لیے ضروری ہے کہ ایمان صرف دل سے ماننے یا زبان سے اقرار کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا عملی اظہار بھی ضروری ہے۔

نماز تمام عبادتوں میں سب سے افضل عبادت ہے۔ جس کے افضل ہونے کی

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نماز میں ایمان کے ہر جزء کی مکمّل نمائندگی ہوتی ہے۔ کیونکہ نما
میں شروع سے آخر تک دل میں نیت رہتی ہے۔ زبان ہر حالت میں کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی
ہے اور جسم مختلف حالات میں عبادت کا حق ادا کرتا ہے۔ نمازی کبھی کھڑا ہوتا ہے
کبھی رکوع کرتا ہے، کبھی سجدہ کرتا ہے، کبھی اُٹھتا ہے، کبھی جُھکتا ہے، کبھی سید
ہوتا ہے۔ اس طرح جسم کی رَگ رَگ عبادت میں حصہ دار بن جاتی ہے۔ نماز میں نیت دل
کے یقین کی نمائندگی کرتی ہے۔ زبان کے اقرار کی نمائندگی اذان سے سلام تک ہوتی رہتی
ہے اور اعضاء و جوارح سے عمل کرنے کی نمائندگی قیام، رکوع، سجدے وغیرہ میں۔

عام حالت میں نماز میں کوئی چیز کم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ مجبوری او
معذوری کی صورت میں حسب ضرورت نماز کے اجزا کم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص
کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا ہے تو بیٹھ کر پڑھے، اگر بیٹھ بھی نہیں سکتا تو لیٹ ک
پڑھے، اور رکوع اور سجود کے لیے گردن جُھکانے سے بھی معذور ہے تو آنکھ ک
اشارہ سے رکوع اور سجود ادا کرے، اور اگر آنکھ کھولنا یا بند کرنا بھی ممکن نہیں ہے
صرف دل میں رکوع اور سجود کا خیال کرے، اس کی نماز ادا ہو جائے گی۔ یعنی نما
میں کوئی چیز مجبوری کی بنا پر چھوڑی جاسکتی ہے مگر نیت جو دل کے یقین کی ترجمانی کر
ہے اس کا ترک کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح حالتِ ایمان میں خطرناک حالات
مجبوری سے زبان کے اقرار یا عمل کے اظہار کو ترک کیا جاسکتا ہے۔ لیکن دل کے یقی
کو ہر حال میں قائم رکھنا پڑے گا۔

دراصل تقیہ دل کے یقین کے ساتھ زبان کے اقرار یا عمل کے اظہار کو ملتوی کر

کا نام ہے اور اسی حد تک اس اقرار و اظہار کو ملتوی کرنا جائز ہوگا جس حد تک خطرہ کو دور کرنے کے لیے ملتوی کرنا ضروری ہو ـــــ بلاضرورت یا ضرورت سے کم یا ضرورت سے زیادہ اقرار و اظہار کو ملتوی کرنا جائز نہیں ہے۔

غرض کہ ایمان میں دل کا یقین کسی وقت بھی بدلا نہیں جا سکتا بلکہ مرتے دم جب آدمی زبان کے اقرار یا عمل کے اظہار سے مجبور ہو جاتا ہے تب بھی دل کا یقین ہی ہوتا ہے جو اُس کو ایمان پر مرنے کا موقع دیتا ہے۔ اگر مرتے دم دل کا یقین ڈگمگا جائے تو ایمان پر موت نہیں ہوتی ہے۔ البتہ جان بچانے کے لیے زندگی میں زبان کا اقرار یا عمل کا اظہار اسی طرح ملتوی ہو سکتا ہے جس طرح بیماری میں غذا یا پانی یا ہوا کے استعمال پر پابندی لگ جاتی ہے۔ لیکن مرض دور ہوتے ہی ان چیزوں کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ غذا یا پانی یا ہوا کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح زبان کے اقرار یا عمل کے اظہار کے بغیر ایمان باقی نہیں رہ سکتا البتہ مریض معاشرے میں مومن کی جان یا مال یا آبرو بچانے کے لیے اقرار و اظہار پر اسی طرح محدود پابندی لگائی جاتی ہے جیسے بیماری میں غذا روک دی جاتی ہے۔ اس لیے یاد رکھنا چاہیئے کہ دل کا یقین ایمان کی زندگی کا دوسرا نام ہے اور تقیہ کی حیثیت دوا کی ہے۔ جس طرح دوا کا بے وقت و بلاضرورت استعمال ناجائز ہے اسی طرح بلاضرورت اور بے محل تقیہ بھی حرام ہے اور جیسے ضرورت پر دوا کو استعمال نہ کرنا ناجائز ہے اسی طرح ضرورت پر تقیہ نہ کرنا بھی حرام ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ تقیہ دوا ہے، غذا نہیں ہے۔ ایمان کا اقرار اور عمل غذا ہیں دوا نہیں ہیں۔ غذا کو دوا بنانا یا دوا کو غذا بنانا مہلک اور تباہ کن غلطی ہے۔ لہٰذا بر وقت تقیہ نہ کرنا یا

بے وقت تقیہ کرنا دونوں ایمان کے لیے تباہ کُن اور مہلک ہیں۔

جناب حزقیل جو فرعون کے چچا زاد بھائی تھے اور جن کو فرعون نے اولاد نہ ہونے کی بنا پر اپنا ولی عہد بنایا تھا وہ مومن تھے۔ قرآن میں ان کو مومنِ آلِ فرعون کہا گیا ہے اور تعریف کی ہے کہ یہ وہ مومن تھا جو مخالف ماحول میں بھی مومن رہا اور اُس نے اپنے ایمان کی حفاظت ایمان کو پوشیدہ رکھ کر کی۔

پیغمبرؐ اسلام نے اپنی ایک حدیث میں فرمایا کہ تین صدیق گزرے ہیں۔ ایک حزقیل، مومنِ آلِ فرعون۔ دوسرے حبیب نجّار مومنِ آلِ یٰسٓ۔ تیسرے علی بن ابی طالب علیہ السلام۔ اس حدیث سے جناب حزقیل کی قدر و منزلت واضح ہو جاتی ہے۔

فرعون کے گھر میں دو مومن تھے۔ ایک مرد، ایک عورت۔ اور دونوں فرعون اور فرعونیوں سے اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھے۔

ایک جناب حزقیل،

دوسری فرعون کی بیوی جن کا نام آسیہ تھا۔

دونوں نے تقیہ کے ذریعے اپنے ایمان کی حفاظت کی ہے اور پیغمبرؐ اسلام نے دونوں کی مدح کی ہے۔

جناب حزقیل کے بارے میں آپ نے پیغمبرؐ کی حدیث ابھی سُنی کہ وہ دنیا کے تین منتخب صدیقوں میں سے ایک ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں پیغمبرؐ نے فرمایا کہ قیامت تک پیدا ہونے والی عورتوں میں سب سے افضل چار عورتیں ہیں:

پہلی فرعون کی بیوی آسیہؑ،

دوسری جناب مریمؑ،
تیسری جناب خدیجہؑ،
چوتھی جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا ہیں، جو ان چاروں میں سب سے افضل ہیں۔

اگر نظر ڈالیے تو ایمان اور اسلام کی حفاظت میں ایک حزقیل اور ایک آسیہ بار بار نظر آئیں گے۔ حضورؐ نے جب مکّہ کے فرعونی معاشرے میں اسلام کی تبلیغ شروع کی تو ابوطالبؑ اور خدیجہؑ کی شخصیتیں نظر آئیں۔

حضرت علیؑ کے عہد میں اسماء بنتِ عمیس اور محمد ابن بکر نظر آئے۔

فاطمہ زہراؑ کی حمایت کرتے ہوئے قیس ابن سعد ابن عبادہ اور دارمیہ کندیہ نظر آئیں۔

جب حسینؑ مدینہ سے چلے تو زینبؑ و عباسؑ نظر آئے اور اسی قافلے میں سکینہؑ اور اصغرؑ نظر آئے۔

بات کہیں سے کہیں جانکلی جب کہ میرے بیان کا مقصد یہ تھا کہ ایمان کے تین جز ہیں اور تینوں پر عمل ضروری ہے۔ دل میں یقین ہونا چاہیے۔ زبان سے ایمان کا اقرار بھی ہونا چاہیئے اور عمل سے ایمان کا اظہار بھی ہونا ضروری ہے۔ دل کے یقین کا نام اصول دین کا یقین ہے۔ زبان سے اقرار کا نام کلمہ پڑھنا ہے۔ عمل کے اظہار کا نام فروع دین پر عمل کرنا ہے۔ ایمان کے ہر حصّے پر جیسا کامل عمل کربلا والوں نے کیا ہے ویسا عمل کرنے کا موقع دوسروں کو نہیں ملا۔ ایک کے بعد ایک کا شہید ہونا اور وہ بھی اس طرح کہ امامؑ کو میدان میں کسی کو بھیجنا نہ پڑے، بلکہ لوگ خود اپنے کو شہادت کے

لیے پیش کریں، مائیں اولادوں سے شہید ہونے کی فرمائش کریں، ذرا شہادت میں دیر لگے تو ناخوشی کا اظہار کریں اور جب شہیدوں کی لاشیں آئیں تو وارث سجدۂ شکر کریں۔ دل کے یقین کا اس سے بڑا کوئی مظاہرہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس مظاہرے کا سب سے زیادہ رقّت خیز و ولولہ انگیز موقع وہ ہوتا تھا کہ شہید اپنے وارثوں سے رخصت ہوتا تھا۔ ہر دینِ خدا کی حفاظت میں جان دینے والے کو معلوم تھا کہ میرے بعد میرے وارثوں کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس تصوّر کو سامنے رکھ کر شہیدوں کا خدا حافظ کہنا اور وارثوں کا رخصت کر دینا، تاریخِ بشر میں انوکھا موقع تھا۔ پھر بھی شہادت حسینؑ پر مصائب اپنی حد سے گزر گئے تھے۔ اُس وقت اہلِ حرم کا دمشق تک کے سخت ترین سفر اور قید خانۂ شام کے قیامت خیز قیام کے لیے اپنے کو تیار کرنا، دل کے یقین کی معراج تھی اور اس معراج میں بچے، عورتیں، بیمار، کنیزیں اور سیدانیاں سب ہی شریک تھے۔ شہیدوں نے میدانِ جہاد میں رجز پڑھ کر اور اسیروں نے بازاروں اور درباروں میں تقریریں کر کے زبان کے اقرار کا مشکل ترین امتحان دیا۔ جہاں رونے پر طمانچے اور تازیانے مارے جاتے ہوں وہاں ظالموں کو ٹوکنا، حق بات کہنا، دشمنوں کے بھرے مجمع میں تقریریں کرنا صرف کربلا والوں کا ہی کام تھا۔

کربلا سے قید خانۂ شام تک بھوک و پیاس میں مصائب کے ہجوم میں کمزوری اور ناتوانی میں جلتی ریت پر تیمم کر کے، برستے تیروں میں کھڑے ہو کر نمازیں پڑھنا، گیارہ محرم کی رات کو سجدۂ شکر میں گزار دینا، کربلا سے دمشق تک کے سفر میں نمازِ شب کو قضا نہ ہونے دینا۔ قید خانۂ شام میں ناطاقتی کے باعث بیٹھ کر نمازیں پڑھنا، عملی اظہار پر کربلا والوں کا ایسا عمل ہے جس کے لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ وہ لوگ

یں جن پر عبادت ناز کرتی ہے۔ وہ دنیا سے گزر گئے جن پر کل عبادت نے ناز کیا تھا۔ آج جن سے وابستگی پر ہم کو ناز ہے اور ہم تو کیا قیامت تک انسانیت، دین، یمان اور اخلاق اُن پر ناز کرتے رہیں گے۔ بلکہ اُن کی صحیح تعریف یہ ہے کہ خود خدا پنے اُن بندوں پر ناز کرتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دوسرے لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھا کر جنّت میں لائے جائیں گے اور کربلا والے اس طرح لائے جائیں گے کہ زمینِ کربلا کا وہ حصّہ اٹھا کر جنّت میں رکھ دیا جائے گا جس میں شہداء دفن ہیں۔

دنیا میں ہر مرنے والے کو دفن ہونے کا موقع مل جاتا ہے لیکن افسوس کربلا میں نبیؑ زادہ اور اس کے اعزّہ و اصحاب کی لاشیں دفن کرنے والا کوئی نہ تھا۔ جو دفن کر سکتا تھا اس کو زنجیروں میں جکڑ کر کربلا سے قیدی بنا کر لے جایا گیا۔ دفن کرنے کے بجائے لاشوں کے سر کاٹ کر نیزوں پر چڑھائے گئے اور لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے، لاشوں کو جلتی ریتی پر چھوڑ دیا گیا اور لاشِ حسینؑ کو اس قدر پائمال کیا گیا کہ جب جناب زینبؑ لاش پر پہونچیں تو آپ نے بھائی کی لاش کو نہ پہچانا، بلکہ ساتھ آنے والی عورتوں سے کہا، میں نے تو تم سے کہا تھا کہ مجھے میرے بھائی کی لاش پر لے چلو۔ یہ سُن کر اُن عورتوں نے عرض کیا:

"بی بی، یہی آپ کے بھائی کی لاش ہے۔"

بہن نے بھائی کی لاش دیکھ کر فریاد کی:

"ارے یہ میرے بھائی کی لاش ہے۔ یہ اُس کی لاش ہے جس کو میری ماں نے چکّی پیس پیس کر پالا تھا۔ ارے یہ میرے بھائی کی لاش ہے جس کو میرے بابا نے پال کر پروان چڑھایا تھا۔"

زینبؑ بے قرار تھیں، کلیجہ منھ کو آتا تھا، عورتیں تسلّی دے رہی تھیں، مگر تسلّی دینے والیاں بھی حیران تھیں کہ کیا کہہ کر تسلّی دیں۔ بے قرار زینبؑ کبھی فرات کی طرف دیکھتی تھیں اور عبّاسؑ کو آواز دیتی تھیں کہ میرے شیر آؤ، دیکھو یہ تمھارے امام کی لاش ہے جو پہچانی بھی نہیں جاتی۔ کبھی قتل گاہ کی طرف رُخ کرتی تھیں اور صدا پر صدا دیتی تھیں۔ اکبرؑ، عون و محمدؑ۔ قاسمؑ، اولادِ جعفرؑ و عقیلؑ، اے بنی ہاشم کے شیرو! اے حسینؑ کے ساتھیو! اے اپنے امام کے وفادارو! آؤ، ذرا اپنے امام کو دیکھو کہ لاش بے سر اس طرح پڑی ہے کہ حسینؑ کو زینبؑ نے بھی نہ پہچانا۔ قتل گاہ میں زینبؑ کب تک رہیں۔ بھائی کی لاش پر کیسا کیسا روئیں، کیسے کیسے بین کیے۔ کس کی زبان ان کو بیان کر سکتی ہے۔؟

لیکن میں سوچتا ہوں کہ بڑا سخت امتحان تھا، جب زینبؑ جیسی چاہنے والی بہن نے حسینؑ جیسے بھائی کی لاش دیکھی اور نہ پہچانا لیکن اس سے زیادہ سخت امتحان تب تھا جب بیبیاں زینبؑ سے کہہ رہی تھیں۔ بچّوں کی دیکھ بھال کے لیے واپس چلو۔ بہن بھائی کی لاش کو تنہا چھوڑ کر کیسے جائے، دنیا میں کس بہن نے بھائی کی لاش کو تنہا چھوڑا ہے جو زینبؑ قتل گاہ سے واپس چلی آئیں، شاید بہن کو بھائی کی وصیّت یاد آئی کہ زینبؑ میرے بچّے تیرے حوالے اور یہ سوچ کر زینبؑ واپس آگئیں۔ جہاں خیمے نصب تھے اب وہاں راکھ کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

عزادارو! زینبؑ قتل گاہ سے خیمہ گاہ پہونچیں مگر ایک خیال ہے جو زینبؑ کو بے چین کیے دیتا ہے۔ اگر میرے گھر کے چراغ زین العابدینؑ نے باپ کی لاش کا حال پوچھ لیا تو میں کیا جواب دوں گی۔ سید سجّاد کو اطلاع ملی کہ پھوپھی اماں بابا کی لاش سے واپس آگئی

ہیں مگر آپ نے کچھ نہ پوچھا، بلکہ آپ کا غم یہ سوچ کر اور بڑھ گیا کہ میں اتنا مجبور ہوں کہ بابا کی لاش تک بھی نہ جا سکا۔

۱۱ر محرم کو جب شمر قیدیوں کو قتل گاہ سے لے کر نکلا تو باپ کی لاش دیکھ کر سید سجّاد اتنے بے تاب ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا روح پرواز کر جائے گی۔ زینبؑ کے علاوہ کون تھا جو سید سجّاد کو تشفّی دیتا۔ زینبؑ ہی نے بھتیجے کو سنبھالا خود اپنا غم بھول گئیں، کیونکہ بھائی کی وصیّت تھی جس کا بار بار خیال آتا: زینب! میرے بچّوں سے خبردار رہیو۔

دوسری مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قال اللہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا
مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (سورہ التوبہ، آیت۔۱۱۹)

ارشادِ خداوندِ عالم ہے: "اے ایمان والو! پرہیزگار بنو، یعنی تقویٰ اختیار کرو اور صادقین (سچوں) کے ساتھ ہو جاؤ۔"

اس ارشاد میں دو ہدایتیں ہیں: ایک پرہیزگار بننے کی، دوسرے صادقین کی یروی کرنے کی۔ اور پرہیزگار بننا ہی ایمان کا حاصل ہے۔

ایمان ایک درخت ہے۔ اس درخت کے پھل کا نام تقویٰ اور پرہیزگاری ہے، ہ درخت دل کی زمین میں لگایا جاتا ہے، اس درخت کی جڑوں کا نام اصولِ دین ہے ور شاخوں کا نام فروعِ دین ہے۔ درخت پھل حاصل کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ گر پھل آنے کی امید ختم ہو جائے تو درخت لگانے والا ہی درخت کو کاٹ ڈالتا ہے اور لا دیتا ہے۔ چوں کہ ایمانی درخت کے پھل کا نام تقویٰ ہے۔ لہذا ایمان کے بعد اگر

تقویٰ نہیں پیدا ہوتا ہے تو خطرہ ہے عذاب کا، خطرہ ہے آگ کا، خطرہ ہے خدا کی ناراضگی کا، خطرہ ہے معصومین علیہم السلام کی ناخوشی کا۔

تقویٰ کے بھی درجے ہوتے ہیں۔ کم سے کم تقویٰ یہ ہے کہ ہم پر جتنے واجبات ہیں ان میں سے ہر حکم پر عمل کریں اور ہم کو جن محرمات سے روکا گیا ہے اُن میں سے ہر حرام سے بچیں، واجب کو ادا کرنے اور حرام سے بچنے کی کوشش برابر جاری رہنا چاہیے' البتہ اس کوشش کے بعد بھی اگر کوئی واجب چھوٹ جائے یا حرام سرزد ہو جائے تو تقویٰ کی نشانی اور علامت یہ ہے کہ ہم کو ایسی ہر غلطی پر ایسا افسوس ہو جیسے ہم سے بڑی دولت ضائع ہو گئی ہو۔ ہمارا رنج ایسا ہونا چاہیے جیسے بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔ ہم کو ایسی شرمندگی ہونی چاہیے جیسی بڑی سے بڑی غلطی پر ہوتی ہے۔ ہم کو ایسا خوف محسوس ہونا چاہیے جیسا خوف کسی مجرم کو حکومت سے ہوتا ہے۔ اگر کسی بھی گناہ کے سرزد ہونے پر ہم اپنے اندر افسوس، شرمندگی اور خوف محسوس کریں تو ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ہم میں تقویٰ پایا جاتا ہے۔ گناہ پر افسوس، شرمندگی اور خوف کا پیدا ہونا بتاتا ہے کہ ہمارے دل میں لگا ہوا ایمان کا درخت سرسبز و شاداب ہے، ہرا بھرا ہے، خشک نہیں ہوا ہے ــ یہی افسوس ہم کو اگلے گناہوں سے بچائے گا، یہی شرمندگی ہم کو استغفار پر آمادہ کرتی رہے گی، یہی خوف ہم کو توبہ کرنے کے لیے بے چین کرتا رہے گا۔

تقویٰ اور پرہیزگاری ایمان کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح صحت اور تندرستی کے لیے پرہیز ضروری ہے۔ پرہیز کرنے کے بھی دو مواقع ہوتے ہیں:

پہلا موقع یہ ہے کہ بیمار ہونے سے پہلے کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اور

اوڑھنے میں ایسا پرہیز کرلیا جائے کہ آدمی بیمار ہی نہ ہونے پائے۔
دوسرا موقع پرہیز کا یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی بیمار ہوجائے تو دوا کے ساتھ ایسا پرہیز کرے کہ دوا جلد از جلد فائدہ کرسکے اور مکمل صحت حاصل ہوجائے
اسی طرح پرہیزگاری اور تقویٰ کے بھی دو مواقع ہیں :
پہلا موقع یہ ہے کہ آدمی اپنے کو گناہ سے بچاتا رہے تاکہ ایمانی صحت و توانائی میں گناہ کے ذریعے ضعف اور بیماری پیدا ہی نہ ہونے پائے۔
دوسرا موقع یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ گناہ ہوجائے تو گناہگار اپنے لیے جلد از جلد گناہ کے اثرات دور کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً نماز قضا ہوگئی تو فوراً ہی اُس کی قضا ادا کرے۔ اگر روزہ نہیں رکھا ہے تو اس کی قضا کے ساتھ اُس کا کفّارہ بھی ادا کرے۔ اگر کسی کا مال غصب کرلیا ہے تو جلد از جلد مال کو مالک تک واپس پہونچائے اور ان تمام باتوں کے ساتھ خدا سے توبہ و استغفار کرتا رہے تاکہ آئندہ اُس سے دوبارہ گناہ نہ ہونے پائے۔
خداوند عالم کی مہربانیوں میں سے ایک عظیم مہربانی یہ ہے کہ اُس نے توبہ کا دروازہ کھُلا رکھا ہے اور توبہ کرنے والے کے گناہوں کو اس طرح معاف کردیتا ہے جیسے وہ آج ہی بے گناہ پیدا ہوا ہے۔ اس غفور و رحیم خدا کا اعلان ہے کہ میرے بندو! کبھی بھی میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔
البتہ توبہ کے بارے میں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ آثارِ موت کے ظاہر ہوجانے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی ہے۔ جب تک موت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے اُس وقت تک توبہ کا موقع باقی رہتا ہے، چاہے توبہ کرتے ہی آثارِ موت ظاہر ہوجائیں تب بھی

توبہ قبول ہو جائے گی۔

آثارِ موت ظاہر ہونے کے بعد توبہ قبول نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آثارِ موت ظاہر ہونے کے بعد کی جانے والی توبہ خدا سے نہیں کی جاتی بلکہ موت سے کی جاتی ہے۔ اگر موت ہٹ جائے تو توبہ کرنے والا پھر گناہ کی طرف عود کر آئے گا۔ لہذا آثارِ موت کے ظاہر ہونے کے بعد والی توبہ، توبہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک حیلہ اور بہانہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آدمی کو زندگی میں عمل کا موقع دیا گیا ہے۔ زندگی کے بعد نہ گناہ کا موقع ہے، نہ عبادت کا۔ نہ توبہ کا موقع ہے نہ استغفار کا۔ معلوم ہوا کہ بس عمل کی حد زندگی تک ہے، جب آثارِ موت طاری ہو گئے تو زندگی معطّل ہو گئی، بلکہ زندگی برطرف ہونے لگی لہذا عمل کا موقع بھی ختم ہونے لگتا ہے اسی لیے موت کے وقت کی توبہ قابلِ قبول نہیں ہے۔

کسی کو نہیں معلوم ہے کہ موت کب آجائے گی۔ لہذا توبہ کو ٹالنا نہیں چاہیے۔ پہلے حادثاتی موت کم ہوتی تھیں لیکن آج جس قدر ترقی و تہذیب و تمدّن میں اضافہ ہو رہا ہے اسی قدر اچانک اموات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری زندگی اور موت پر ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کا بھی بہت اثر پڑتا ہے۔ بدکاریاں زندگی کو کم کر دیتی اور بدکاروں کی موت اکثر بے برکت ہوتی ہے۔ نیک اعمال بجالانے والے بندوں کی عمر، روزی اور اولاد میں خدا برکت دیتا ہے۔

ہمارے اس موجودہ معاشرے اور ماحول میں کارِ خیر کرنے کا جذبہ تو پایا جاتا ہے لیکن گناہوں سے بچنے کا خیال بہت کم پایا جاتا ہے۔ اس غلط اندازِ فکر کے باعث ہمارے کردار میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ ہم دین دار بھی ہیں اور بے دینی کے کام بھی

کرتے رہتے ہیں۔ ہم کو دین سے محبت بھی ہے اور عبادت ہم کو بوجھ بھی معلوم ہوتی ہے۔ ہم دین کا شوق بھی رکھتے ہیں اور بے دین ترقی پسندی کا ذوق بھی رکھتے ہیں حالانکہ کارِ خیر سے زیادہ اہمیت گناہوں سے بچنے کی ہے، گناہوں سے بچنے کی کوشش کا نام تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

ایک شخص نے امامؑ کی خدمت میں آکر سوال کیا۔ آپ نے جو دعا تعلیم فرمائی ہے میں اس کو بہت عرصے سے پڑھ رہا ہوں اور جب ایک بار پڑھنے کے بعد جنّت میں گھر، نہر، باغات تیار ہو جاتے ہیں تو اب جنّت میں ہمارے لیے بہت سے گھر، باغات اور بہت سی نہریں تیار ہو چکی ہوں گی۔ لہٰذا اگر اب ہم عبادت کرنا چھوڑ دیں تو کیا حرج ہے۔

امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ایک آدمی سالہا سال میں ایک باغ تیار کرتا ہے، ناہموار زمین کو برابر کرتا ہے، زمین میں اُگانے کی طاقت پیدا کرتا ہے، پھر تخم پاشی اور آبیاری کرتا ہے، درختوں کی جانوروں، انسانوں اور سردی گرمی سے حفاظت کرتا ہے۔ جب ایک طولانی مدّت میں وہ باغ تیار ہو جائے تو اس میں جو سوکھے پتّے پڑے ہوئے ہوں اُن کو جمع کر کے ایک چھوٹی سی چنگاری ڈال دی جائے تو بتاؤ کہ اس کا کیا حشر ہوگا۔

اُس شخص نے عرض کی۔ مولا! تھوڑی دیر ہی میں باغ جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گا اور سالہا سال کی محنت چند منٹ میں برباد ہو جائے گی۔

امامؑ نے فرمایا، بس اسی طرح جنت میں تیار ہونے والے باغوں کو نہ گنو بلکہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رہو، ورنہ گناہ کی ایک چنگاری بھی جنّت کے سارے باغوں کو جلا کر خاک کر دے گی۔ اس لیے نہ عبادت ترک کرو اور نہ کوئی دوسرا گناہ سرزد ہونے دو۔

غرض کہ ہر مومن کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے لیے تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرے۔ اور تقویٰ کا مطلب کم از کم یہ ہے کہ واجبات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، والدین کی اطاعت، بیوی بچوں کی دیکھ بھال، پردیسی کی خبر گیری وغیرہ ترک نہ ہونے پائے اور کوئی حرام و ناجائز فعل مثلاً جھوٹ بولنا، لوگوں کو ستانا، غیبت کرنا، شراب پینا، سود لینا یا دینا، غاصبانہ قبضہ کرنا وغیرہ کوئی بھی گناہ سرزد نہ ہونے پائے۔

گناہوں سے بچنے اور واجبات کو ادا کرنے کی جتنی کوشش کربلا والوں نے کی ویسی کوشش کا مظاہرہ کسی اور کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔ موت، خوف، لالچ، بھوک، پیاس، دھوپ، کمزوری، بیماری، قتل، قیدِ بے بسی، غرضکہ کوئی چیز باقی نہ رہی جس نے کربلا والوں سے یہ نہ کہا ہو کہ حسینؑ کا ساتھ چھوڑ دو۔ یزید کی طرف آجاؤ۔ مگر ایمان و تقویٰ کے مالک کربلا والوں نے نہ حسینؑ کا ساتھ چھوڑا اور نہ یزید کا ساتھ دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حسینؑ کا ساتھ دینا واجب ہے اور یزید کا ساتھ دینا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ یہ کربلا والے ہیں جن پر ایمان اور تقویٰ ناز کرتا ہے۔

کربلا میں ایسے افراد جمع ہوئے تھے جن پر ایک دوسرے کو ناز تھا۔ خدا کو اپنے اُن بندوں پر ناز تھا جو اُس کے دین کی حفاظت کے لیے مر مٹنے پر تیار تھے اور دین پر مر مٹنے والے بندوں کو اُس خدا پر ناز تھا کہ جس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ مصائب کو بصد شوق گلے لگا رہے تھے۔ امام حسینؑ، شبِ عاشورا اپنے اصحاب و اعزا پر ناز کر رہے تھے کہ میرے بزرگوں کو بھی ایسے اعزا و اصحاب نہیں ملے۔ اعزا و اصحاب، شبِ عاشور جانوں کے نثار کرنے کا اعلان کر کے اپنے امامؑ پر اپنے ناز کا اظہار کر رہے تھے۔ مائیں اُن اولادوں پر نازاں تھیں جو جامِ شہادت کے پیاسے تھے۔ اولادیں اُن

ماؤں پر نازاں تھیں جو روکر نہیں بلکہ دل بڑھا کر میدان میں بھیج رہی تھیں۔ بھائی پر بہنیں نازاں تھیں اور بہنوں پر بھائی نازاں تھے۔ کیونکہ ایک شہید ہو رہا تھا اور دوسری اسیر ہونے والی تھی۔ اسیر شہید کو میدانِ جنگ میں بھیج رہی تھی اور شہید وارث کو خدا کے حوالے کر کے مرنے جا رہا تھا۔

صبر کو سید سجادؑ پر، شہادت کو حسینؑ پر، وفا کو عباسؑ پر، قیادت کو زینبؑ پر ناز تھا۔ آج بھی دنیا کا ہر حسینی اپنے حسینی ہونے پر نازاں ہے اور بھرپور نازاں ہے۔ مگر آج ہر یزیدی یزید کے کئے پر شدّت کے ساتھ شرمندہ ہے۔

۱۱ محرم کو کربلا کا میدان بالکل خالی ہو گیا تھا۔ جہاں کل ہزاروں کا مجمع تھا وہاں آج ہُو کا عالم تھا۔ مگر نہیں، جب لشکرِ یزید چلا گیا، شہدار کی لاشیں کربلا میں موجود تھیں۔ جانے والے اسیر رہا ہو کر پھر کربلا آئے، مگر یزیدی لشکر پھر کربلا واپس نہ آسکا۔ چنانچہ شہدار اور اسیروں کا تذکرہ باقی ہے اور یزیدیوں کے لیے سوائے لعنت کے اور کوئی ذکر باقی نہیں ہے بڑا سخت وقت تھا جب بکیس اسیر اس طرح لے جائے جا رہے تھے کہ ان کے وارثوں کی لاشیں کربلا میں بے گور و کفن پڑی تھیں اور کوئی نہ تھا جو اُن کو دفن کرتا، کوئی نہ تھا جو اُن پر روتا، کوئی نہ تھا جو اُن کے سرھانے شمع روشن کرتا، کوئی نہ تھا جو اُن لاشوں کو پہچان سکتا، کیونکہ سر کاٹ لیے گئے تھے، لاشیں پائمالِ سمِ اسپاں کر دی گئی تھیں لاشوں پر سے قیمتی سامان ہی نہیں بلکہ لباس بھی اُتار لیا گیا تھا۔ جانے والے اسیر اُن ہی لاشوں کے درمیان سے لے جائے جا رہے تھے اور اسی لیے لے جائے جا رہے تھے تاکہ بکیس قیدی تڑپ کر رہ جائیں۔ قیدی چلے گئے، روتے ہوئے چلے گئے، سر پیٹتے ہوئے چلے گئے، بیبیاں آہیں بھرتی ہوئی چلی گئیں اور ظالم یہ سمجھتے ہوئے چلے گئے

کہ اب شہیدوں کا پوچھنے والا کربلا میں کوئی نہیں۔ لیکن خدا نے ستّر ہزار ملائکہ اُتارے جو قیامت تک قبرِ حسینؑ کا طواف کرتے رہیں گے اور اس طرح طواف کرتے رہیں گے کہ اُن کے سر اور چہروں پر خاک ملی ہوگی۔ اُن میں سے ہر مَلک قیامت تک حسینؑ پر روتا رہے گا۔ قبرِ حسین قیامت تک کے لیے آباد ہو گئی۔ صرف ملائکہ ہی لاشِ حسینؑ پر نہیں اُترے بلکہ انبیاء بھی کربلا میں آئے جن میں حضور سرورِ کائناتؐ بھی تشریف لائے اور بیحد بے چین تشریف لائے۔ جناب آدمؑ، جناب ابراہیم وغیرہ آپ کو سنبھالے ہوئے لائے، تسلّی دیتے ہوئے لائے اور جب آپ لاشِ حسینؑ پر تشریف لائے تو لاش کو دیکھ کر فرمانے لگے، میرے لال، میرے فرزند، میرے بیٹے! تجھ کو میری امت نے نہیں پہچانا، تیرے رُتبہ کو نہیں مانا، تیرے حق کو ادا نہیں کیا، تجھے قتل کر ڈالا، پیاسا قتل کر ڈالا۔ میں دیکھ رہا تھا میرے لال، کہ تم پانی مانگ رہے تھے مگر کسی نے تم کو پانی نہیں دیا۔ لاشِ حسینؑ پر نانا رو رہے تھے۔

اسی وقت آسمان سے ایک عماری اُتری جس میں سے چند عورتیں برآمد ہوئیں۔ یہ عورتیں بھی ایک معظمہ کو سنبھالے تھیں جن کی بے چینی بیان نہیں کی جاسکتی۔ یہ معظمہ حسینؑ کی مادرِ گرامی تھیں جو جنّت سے حسینؑ پر رونے کے لیے کربلا آئی تھیں۔ جن کے ساتھ آنے والی عورتیں جناب سارہؑ و جناب مریمؑ صبر کی تلقین دیتی تھیں۔ مگر وہ ماں کیسے صبر کرے جس کے سامنے اس کے معصوم بیٹے کی بے سر لاش پر گھوڑے دوڑائے جارہے ہوں۔ کسی نہ کسی طرح ماں اپنے لال کی لاش پر پہونچیں۔ لاش کا حال دیکھا، مقتل میں پھیلی ہوئی شہداء کی لاشوں کو دیکھا۔ جہاں خیمے لگے تھے وہاں کا اُجڑا ہوا منظر دیکھا۔ کیا عجب ہے کہیں جلا ہوا اصغرؑ کا جھولا بھی دیکھا ہو، زمین پر جگہ جگہ اپنے دل کے ٹکڑوں کا بہا ہوا

خون دیکھا ہو، جانے والے اسیروں کے قدموں کے نشانات کو دیکھا ہو اور پھر حسینؑ کی
لاشِ بے سر پر اپنے بابا کو روتے ہوئے دیکھ کر فریاد کی ہو، کہ بابا آپ نے دیکھا، آپ
کی اُمّت نے میرے لال کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔

کل جب کمسن اور ننھے سے حسینؑ اپنی مادرِ گرامی کی گود میں تھے تو باپ نے بیٹی
سے کربلا کی قربانیوں کا وعدہ لیا تھا۔ آج جب حسینؑ قربانیاں دے چکے تو باپ اپنی بیٹی
کو تسلّیاں دے رہے ہیں۔ ممکن ہے شہزادی کے آنسو رُک گئے ہوں، باپ کی تسلّی
نے دل کو تسکین دی ہو۔ مگر یہ سوچ کر رو رہا ہوں کہ جب کربلا میں نبیؐ بیٹی کو تسلّی دے
رہے تھے اس وقت بھی زینبؑ، ام کلثومؑ، رباب اور سکینہؑ اونٹ پر چپکے چپکے روتی جا
تھیں جن کو تسلّی دینے والا کوئی نہ تھا۔ جب قتل گاہ کا تصوّر دل میں آتا تھا تو ایک ہوک
اُٹھتی تھی کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا، آنسو نکل پڑتے تھے مگر تازیانوں کے خوف سے آہیں بل
نہ ہوسکتی تھیں۔ یہ وہ بیکس تھے جن پر بیکسی روتی ساتھ ساتھ جارہی تھی۔

تیسری مجلس

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

قال اللہ تعالیٰ: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (سورۃ التوبۃ آیت ۱۱۹)

صاحبانِ ایمان کے نام مالک کا فرمان ہے کہ: "اے ایمان والو! تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔"

یہ کون لوگ ہیں جن کی اطاعت کا حکم ہر مومن کو دیا جا رہا ہے۔ کعبہ نماز کے وقت کا قبلہ ہے کہ اگر نماز ختم ہونے سے ایک سیکنڈ پہلے قبلے کی طرف سے نمازی مڑ جائے تو اُس کی پوری نماز باطل ہو جاتی ہے اور یہ حضرات جن کو خدا نے صادقین کہا ہے ہر مومن کی پوری زندگی کے لیے قبلہ ہیں۔ فکر و عمل ہر چیز میں اُن کی پیروی کرنا ضروری ہے اگر زندگی تمام ہونے سے ایک سیکنڈ پہلے بھی کوئی شخص اُن سے روگردانی کرے تو اس کا ایمان اسی طرح ختم ہو جاتا ہے جس طرح قبلے سے مُڑ جانے کے بعد نماز باطل ہو جاتی ہے۔

ہر چیز کا جاننے والا خدا کبھی ایسے شخص کو فکر و عمل کا دائمی قبلہ نہیں قرار دے سکتا،

جان بوجھ کر یا بھولے سے بھی کبھی کوئی غلطی کر سکے۔ غلطی کی وجہ چاہے علم کی کمی ہو یا فکر کی
ا ہو، نیت کا فتور ہو یا عمل کا قصور ہو۔ بلکہ جو لوگ اپنی زندگی کے کسی حصے میں بھی کوئی غلطی یا
ا کوئی بھول چوک نہیں کر سکتے۔ وہی صادقین ہیں، ان ہی کی پیروی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ان
ں کو تمام عالم کے مومنین کا قبلۂ عمل قرار دیا جا رہا ہے۔ ان کی پیروی کے بغیر ایمان ہو یا تقویٰ
ئی چیز بھی اپنی صحیح حدوں پر باقی نہیں رہ سکتی۔ اُن کی رہبری کی ضرورت عالم انسانیت کو
ر شعبۂ حیات اور ہر مرحلۂ زندگی میں ہے۔ زندگی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی، مسئلہ علمی ہو یا
لی، معاملات ملکی ہوں یا مذہبی، حالات سیاسی ہوں یا سماجی، اُلجھنیں معاشی ہوں یا معاشرتی
ر کردار میں نکھار چاہیے، اگر انسانوں کو آدمیت چاہیے، اگر سماج کو سکون چاہیے، اگر مشکلات کا
ل چاہتے ہیں تو صادقین کی پیروی کرنا ہوگی۔ ان کی قیادت میں انسان کو سفر کرنا ہوگا، جو ہر شخص
و دوزخ سے بچا کر درِ جنّت تک پہونچا دیں گے جن کی روشن اور منوّر زندگیاں انسانوں کو ظلم،
بردستی، من مانی، مطلق العنانی، بے حسی، سنگ دلی، خود فریبی اور خودکشی کے اندھیروں سے
کال کر عدل، امن سکون، ایثار، احترام انسانیت، دین داری، ہمدردی، رحم دلی، خود شناسی
ور ابدی زندگی کے اُجالوں تک پہونچا دیتی ہیں۔ یہ صادقین وہ سفینۂ نجات ہیں جو اپنے مسافروں
کو زندگی کی تنگنائی سے گزار کر لبِ کوثر اُتار دیتے ہیں۔

جذبات کی اُلجھن میں، احساسات کی گھٹن میں، خواہشات کی طوفانی لہروں میں، آرزوؤں
کے سیلاب میں، حالات کے مدّ و جزر میں اگر ہم چاہتے ہیں کہ مزاج میں اعتدال باقی رہے، اقدام
کے بعد کبھی شرمندگی اور افسوس قریب نہ پھٹکنے پائے، زندگی حسرتوں کے ماتم کے لیے وقف
نہ ہو جائے، تو ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم نبیؐ و آلِ نبی علیہم السلام
کی کامل، جامع، حادی اور آفاقی قیادت کو اپنائیں، اُن کی پیروی ہی میں دل کو سکون مل سکتا

ہے۔ دماغ مطمئن رہ سکتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے بآسانی گزرا جا سکتا ہے۔ فاتحینِ عالم لوگوں کو رُلا سکتے ہیں مگر روتے ہوئے انسانوں کو ہنسا نہیں سکتے لیکن جب جماعتِ صادقین کے سربراہ حضور سرورِ کائنات مکہ فتح کرتے ہیں تو فاتح مسلمان اس لیے ہنستے ہیں کہ چھوٹا ہوا کنبہ مل گیا اور مفتوح مکہ کے دشمن اس لیے خوش ہیں کہ سالہا سال کی خطائیں معاف ہو گئیں۔ جو گردنیں اپنے ہاتھوں کٹنے کے قابل بن چکی تھیں وہ کٹنے سے بچ گئیں۔ جن ظالموں کو آج قصاص کے اصول پر پھانسی ملنی چاہیے تھی اُن کو فراخدلانہ معافی نے دوبارہ زندگی عطا کر دی تھی۔ جن گھروں میں رسولؐ کے خلاف ہمیشہ سازشیں ہوتی رہی تھیں، آج وہی گھر پناہ گاہ قرار دیے گئے تھے۔

عام اعلان تھا کہ جو شخص فتنہ کا دروازہ بند کر کے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے وہ امن و عافیت میں ہے۔ رسولؐ کو اُحد کا منظر یاد تھا، اپنے چچا حمزہؓ کی پُر محبت زندگی یاد تھی، اُن کی لاش کا وہ حال یاد تھا جو دیکھنے والوں کے دلوں کو غم و غصّے کی دائمی آگ سے بھر دینے کے لیے کافی تھا۔ رسولؐ کی نگاہوں میں چچا کے قاتل کی صورت گھوم رہی ہے۔ قاتل کو قتل پر اُبھارنے والی اور لاش کی بے حُرمتی کرنے والی ذات، اُس کے پورے کنبے کے سیاہ کرتوت سب کچھ نبیؐ کی نگاہ کے سامنے ہے مگر قاتلِ جناب حمزہؓ کے لیے لوگ معافی کے خواستگار ہوتے ہیں تو جلالِ نبوّت پر حلم طاری ہو جاتا ہے، آپ اس وحشی کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا نام بھی وحشی تھا اور جس کے کام بھی وحشیانہ تھے۔ رسولِ اعظمؐ کے اس کارنامہ کو دیکھ کر گھبرائی ہوئی انسانیت کی وحشت دور ہو جاتی ہے۔ زبردستی کا سر شرم سے جُھک جاتا ہے اور فراخ دلی کو سر بلندی کا موقع ملتا ہے۔ غرورِ ظلم کے بجائے دنیا کو "بھول جاؤ اور معاف کرو" کا رحیمانہ پیغام ملتا ہے۔

اسی نبیؐ کے جانشین زہر آلود تلوار سے زخمی ہوئے، سر لہولہان ہو جاتا ہے، زخم

ماغ تک پہونچتا ہے، خون کے فوارے اس قدر جاری ہوتے ہیں کہ جو کل درِ خیبر کو ہاتھ پر تنکے
کی طرح اُٹھا رہا تھا آج اُس کے لیے سر اُٹھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ تلوار کے وار نے زندگی کو آخری
لمحات میں پہونچا دیا ہے۔ دنیا سے علیؑ جانے والے ہیں، نگاہِ علیؑ کے سامنے اپنے اہل و عیال اور
شیعہ ہیں، امامت کی نظر اُن بے پناہ مصائب کو دیکھ رہی ہے جو اُن کے خاندان اور دوستوں
پر پڑنے والے ہیں مگر جس موقع پر دنیا غم و غصّے میں غرق ہو جاتی ہے۔ لوگ جب آگ اور خون
کی ہولی کھیلنے کے لیے نکل پڑتے ہیں، جب ذہنوں پر انتقام اور صرف انتقام چھا جاتا ہے اور
جیسے انتقام کا بے پناہ جذبہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جو قانون، انصاف کو اس طرح بہالے جاتا ہے
جیسے سیلاب خس و خاشاک کو بہالے جائے۔

علیؑ اس موقع پر بھی جب دودھ پیتے ہیں تو اپنے قاتل کو دودھ پلواتے ہیں۔ علیؑ کیونکہ
زخمی تھے اس لیے دودھ کے علاوہ صبح شہادت تک کسی قسم کی دوسری غذا دینا مناسب نہ تھی
لیکن ابن ملجم کو دودھ کے علاوہ دوسری غذائیں بھی دی جاتی رہیں۔ اپنے بچوں اور دوستوں سے
محبّت کرنا سب کو آتا ہے مگر جو دشمنوں کے ساتھ بھی ہمدردی اور رواداری کرے وہی رہبر
ہوتا ہے۔ جذبات کی شدّت میں بھی جن کے قدم صراطِ مستقیم کی تعمیر کرتے ہیں وہی صادقین
ہیں، وہی عالمِ ایمان کے لیے قبلۂ عمل قرار دیے گئے ہیں۔

جناب امام حسن علیہ السلام نے اُس شامی کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ فرمایا جو آپ کا
سخت دشمن تھا، جو آپ کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا جس نے نازیبا الفاظ کا بے تحاشا
استعمال کیا تھا۔ جب وہ اپنے غصّے کی پوری بارود خرچ کر چکا تو امام حسن علیہ السلام نے
اس سے فرمایا، شاید تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو، اپنی تکلیف بیان کرو، میں تمھاری مدد
کروں گا۔ اس کے بعد امامؑ نے ایک ایک تکلیف پوچھنا شروع کی، کہ بھوکے ہو؟ مقروض

ہو؟ مسافر ہو؟ بے روزگار ہو؟ جو تکلیف ہو بیان کرو، میں تم کو تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔

امامؑ کے اس ہمدردانہ کلام کو سُن کر وہ حیرت میں پڑ گیا کہ کہاں تو میرا یہ سلوک ہے اور کہاں ان کا سلوک۔ میں نے تکلیف پہونچانے میں کمی نہیں کی اور انھوں نے میری ہر تکلیف کو دور کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ چنانچہ جب وہ شخص حیرت واستعجاب سے چونکا تو اس کی زبان پر یہی فقرہ تھا کہ تھوڑی دیر پہلے میں دنیا میں آپ سے زیادہ کسی کا دشمن نہ تھا اور اب آپ کے برابر پورے عالم میں کوئی شخص مجھے محبوب نہیں ہے۔ کامل عقل اور عصمت غرضکہ صادقین جن کی پیروی کا حکم ہے یہ خدا کی طرف سے کامل علم لے کر پیدا ہوتے ہیں لہذا اُن سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔

یہ ایسے سچے ہیں دشمن بھی جن کی سچائی کا اعتراف کرتا ہے۔

مباہلہ میں نصاریٔ نجران نے اسلام قبول نہیں کیا مگر یہ ضرور کہا کہ ہم ایسے سچے افراد کو دیکھ رہے ہیں جو اگر پہاڑوں کو چلنے کا حکم دیں تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر حرکت میں آجائیں۔

یزید، جب امام زین العابدین علیہ السلام کی تقریر کا اثر اپنے درباریوں پر دیکھتا ہے تو اُس کو فکر ہوتی ہے کہ کسی تدبیر سے امامؑ کی تقریر رُک جائے ورنہ ممکن ہے فرزندِ حسینؑ درباریوں کے دلوں پر ایسا قبضہ کرلیں کہ میرے قبضہ سے درباری نکل جائیں۔ وہ لوگوں سے مشورہ لیتا ہے کہ اب کیا تدبیر کی جائے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اذان کہلوائی جائے تو فرزندِ امام حسینؑ احتراماً خاموش ہو جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ دشمن بھی ان کو سچا سمجھتا تھا اُسے بھی اُن کے ناقابلِ تبدیل کردار پر اس پریشانی ومصائب کے باوجود مکمل بھروسہ تھا۔

چنانچہ حکمِ یزید سے ناوقت اذان دی گئی۔ امامؑ نے تعظیماً فوراً ہی اپنی تقریر روک دی۔

مگر جب موذن نے نبیؐ کا نام لیا تو آپ نے یزید سے پوچھا، بتا اے یزید! یہ تیرے دادا کا
نام ہے یا میرے جد کا نام ہے؟ یزید کے پاس امامؑ کے سوال کا جواب نہ تھا، چپ ہو رہا
ہے۔ اسی طرح جب جناب سکینہؑ نے یزید سے پوچھا تھا کہ بتا اگر اس وقت رسولؐ دوبارہ
دنیا میں تشریف لے آئیں تو تیرے پاس تخت پر بیٹھیں گے یا ہم قیدیوں کے پاس زمین پر
تشریف فرما ہوں گے۔؟

تب بھی یزید خاموش ولاجواب تھا۔ امامؑ کی شہادت کے بعد راتوں کو محل میں چھپ کر
روتا بھی تھا مگر اپنے کیے پر شرمندہ نہ تھا، یہ مگرمچھ کے آنسو تھے۔

بہر حال امام کے اہلِ حرم کو یزید نے زندانِ شام سے رہا کر دیا۔ رہائی پاتے ہی
جناب زینبؑ نے ایک خالی مکان کی فرمائش کی تاکہ شہدا پر دل کھول کر روسکیں اور دمشق
کی عورتوں سے شہدا کا پُرسہ بھی لے سکیں۔ چنانچہ یہی ہوا، زینبؑ اور اہلِ حرم دل کھول کر
زار زار روئے دمشق کی عورتیں آئیں، سب کو پُرسہ دیا، پورے دمشق میں حسینؑ پر ماتم ہوا۔

قیدی رہا ہو کر کربلا کے لیے روانگی سے قبل سکینہؑ سے رخصت ہونے لگے۔ درمیان
میں قبرِ سکینہؑ تھی چاروں طرف رونے والی، ماں، پھوپھی، بہنیں تھیں، سب کی نظروں میں پرانے
منظر گھوم گئے ہوں کہ یہ سکینہؑ جو آج قبر میں آرام کر رہی ہے کبھی کربلا میں گھوڑے کے قدموں
سے لپٹ کر بابا کو میدان میں جانے سے روک رہی تھی، یہی سکینہؑ باپ کے سمجھانے کے
بعد اُن کو میدان میں جانے کے لیے یہ کہہ کر رخصت کر رہی تھی کہ بابا اب آپ جائیے
سکینہؑ آپ کو نہ روکے گی۔ جائیے بابا آپ اسلام کی حفاظت کے لیے جائیے اور اپنی جان
قربان کیجیے میں بھی آپ کے بعد ہر تکلیف اور مصیبت برداشت کر لوں اور نہ روؤں گی
یہی سکینہ کبھی خیمہ سے نکل کر میدانِ کربلا میں دوڑتی پھر رہی تھی، کبھی باپ کو، کبھی چچا کو، کبھی

بھیّا کو پکارتی تھی کہ ظالم خیمے لوٹ رہے ہیں، ظالم ہم کو طمانچے مار رہے ہیں، ظالموں نے ہمارے بُندے اس طرح چھینے ہیں کہ کان زخمی ہو گئے ہیں۔ اے بابا آپ کہاں ہیں؟ اے چچا جان آپ کہاں ہیں؟ اے بھیّا آپ کہاں ہیں؟ آئیے اور سکینہؑ کی مدد کو آئیے۔ سکینہ آپ کو پکار رہی ہے۔ جب کوئی جواب نہیں آیا تو سکینہؑ نے قتل گاہ کا رُخ کیا۔ لاشوں کے درمیان باپ کی لاش کو تلاش کرتی رہی مگر نہ پا سکی۔ تھک گئی اور لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر پکارا، بابا! آپ ہی آواز دیجیے۔ یہ سکینہ تھک گئی ہے۔

ایک نشیب سے حسینؑ کی لاش سے آواز آئی، بچّی اُس طرف دوڑی باپ کی لاشِ مطہّر سے لپٹنا چاہتی ہے۔ کوئی حصہ جسم کا ایسا نہیں ہے جو زخمی نہ ہو۔ بچّی یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ اس کے پیارے بابا کی لاش ہے۔ کیسے لپٹتی۔ دشمنوں نے لاشِ مبارک کو اس قدر پائمال کر دیا تھا کہ لاش پہچانی نہ جاتی تھی۔ کچھ دیر تک بچّی باپ کی میّت کو تکتی رہی، پھر سرھانے بیٹھ گئی۔ رونا چاہتی تھی، بین کرنا چاہتی تھی، اپنا حال بیان کرنا چاہتی تھی، اپنے اوپر بیتی ہوئی تکلیفیں سُنانا چاہتی تھی کہ لاشِ حسینؑ سے آواز آنے لگی: "بیٹی! میرے شیعوں سے کہنا کہ جب کبھی پانی پئیں تو میری پیاس یاد کرلیں۔ بیٹی! میرے دوستوں سے کہنا کہ جب کسی پردیسی کی موت کی خبر ملے یا کسی شہید کی شہادت کی اطلاع ملے تو مجھ پر رولینا۔ اے بیٹی میرے رونے والوں سے کہنا کہ حسینؑ نے تم کو کربلا میں عاشور کے دن اُس وقت بہت یاد کیا جب وہ تمھارے ننّھے بھائی علی اصغر کے لیے دشمن سے پانی مانگ رہے تھے اور ظالموں نے بڑی سنگدلی کے ساتھ پانی دینے سے انکار کیا تھا۔

اہلِ حرم کے سامنے آج اسی حسینؑ کی قاصد بیٹی کی قبر تھی جس کے ذریعہ امامؑ نے اپنے دوستوں کو پیغام بھیجا تھا اور سب رو کر سکینہؑ کو آواز دے رہے تھے۔ اے رات دن باپ کو رونے والی! اے رونے پر ستائی جانے والی! اے راستے میں اونٹ پر سے گرنے والی!

اے ہرشام کو پوچھنے والی کہ ہم مدینہ کب جائیں گے! اے بالی سکینہؑ بولو، ہم لوگ کربلا جارہے ہیں، وہاں سے مدینہ جائیں گے۔ بولو سکینہؑ باپ کے نام تمھارا کوئی پیغام ہے۔ چچا کو کچھ کہلواؤ گی۔ بھائی کو سلام کہلواتی ہو۔ مگر سکینہ چپ تھیں، قبر پر خاموشی طاری تھی، اہلِ حرم رو رہے تھے، رباب کی تڑپ حد سے سوا تھی۔ سید سجّاد بھی خاموش تھے۔ بھائی ابھی عالمِ غربت میں بہن کی موت کو بھولا نہ تھا۔ نگاہوں میں وہ منظر ابھی تازہ تھا جب باپ کا سر گود میں لے کر سکینہؑ اتنا روئی تھیں کہ دنیا سے گزر گئیں، بہن، غریب بہن، یتیم بہن، زمانے کی ستائی بہن، چار سال کی کمسن بہن، پردیسی بہن کی ننھی سی لاش زمین پر پڑی تھی۔ بھائی سرہانے بیٹھا رو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کفن کیسے دوں، قبر کیسے بناؤں، غسل کیسے دوں۔

وقت گزر گیا مگر اپنے گہرے اثرات رنج و غم دل پر چھوڑ گیا ـــ رخصت ہوتے وقت شاید امامؑ کا دل اپنی بہن کے لیے بہت بے چین تھا کہ میں اپنی مجبوریوں کی بنا پر، اے بہن! زندگی میں تم کو آرام پہونچا سکا، نہ مرنے کے بعد تمھارے شایانِ شان غسل و کفن دے سکا۔ بہن اپنے مجبور اور قیدی بھائی کو معاف کر دینا ماں اپنے تصوّرات میں ڈوبی تھی پھوپھی اپنے خیال میں غرق تھی۔ سب کو سکینہ یاد آرہی تھیں۔ سب سکینہ پر گزرے ہوئے مصائب کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے کہ جیسے سکینہؑ کی آواز آئی کہ چلو قافلے والو چلو! مجھے قید خانہ میں ڈھونڈو۔ میں کربلا میں تم کو بابا کے پاس ملوں گی۔ چلو جلدی چلو۔ بابا تم سب کا انتظار کر رہے ہیں۔

چوتھی مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: "یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۝" (سورۃ التوبۃ۔ آیت ۱۱۹)

حکمِ خدا ہے اور ہر صاحبِ ایمان کے نام ہے کہ ایمان لانا ناکافی ہے، اس کے ساتھ مُتّقی بننا، پرہیزگاری اختیار کرنا ضروری ہے۔ تقویٰ ہی ایمان کی جان ہے، ایمان کی روح ہے، ایمان کا حاصل ہے۔ لیکن ایمان ہو یا تقویٰ سب بے کار ہیں جب تک ہر معاملے میں صحیح راستہ نہ اختیار کیا جائے۔ علم یا عمل کی غلطی ایمان اور تقویٰ دونوں کو برباد کر دے گی اور غلطی سے پاک روش کا اختیار کرنا ممکن نہیں ہے جب تک صادقین کی مکمل پیروی نہ کی جائے۔ یہ صادقین نبیؐ اور آلِ نبی علیہ السّلام ہیں۔

صادقین کی پیروی کی ہدایت خداوند عالم نے اس لیے نہیں دی ہے کہ اس ذریعے سے صادقین کو پیروی کرنے والوں کے ذریعے کسی قسم کا فائدہ ہوگا، بلکہ صرف اس لیے پیروی کا حکم دیا ہے تاکہ پیروی کرنے والے دنیا میں پُرسکون، پُرامن اور قابلِ فخر زندگی بسر کر سکیں۔ جن کی زندگی دوسروں کو پُرامن و پُرسکون بننے کی دعوت دے سکے اور مرنے کے بعد پیروی کرنے کے باعث جنّت میں آرام و راحت کی زندگی بسر کریں۔

دنیا میں ہر چیز حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی دینی پڑتی ہے۔ مثلاً راحت و آرام

کی قربانی کے بغیر تعلیم حاصل کرنا یا ترقی کرنا ممکن نہیں ہے اسی طرح پیروئ صادقین کے لیے بھی
کچھ قربانی دینا پڑے گی، تب ہی دنیا و آخرت میں پُرسکون و پُر راحت زندگی حاصل ہوگی۔ جو شخص
اپنے نفس کی خواہشات سے جنگ نہیں کرسکتا وہ پیروئ صادقین نہیں کرسکتا۔

صادقین کی پیروی کرنے والوں کو زندگی کے جھوٹے راستے چھوڑنا پڑتے ہیں چاہے اُن
پر چلنا آسان ہی کیوں نہ ہو، اور سچے راستے اختیار کرنے میں چاہے دشواریوں اور مصائب کا
مقابلہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ دوزخ کے سخت عذاب سے بچنے اور جنّت کے آرام و راحت
کو حاصل کرنے کے لیے دنیا میں رہ کر سخت اور دشوار گزار راستوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جن
لوگوں نے زندگی میں سچ اور جھوٹ کا فرق سمجھ لیا تھا انھوں نے صادقین کی پیروی کی اور اس
راہ کی ہر مشکل کو آسان سمجھا۔

صادقین کی پیروی کرنے والوں میں سب سے پہلے حضرت ابوطالبؑ کا نام سرِفہرست
ہوگا جنھوں نے اُس وقت سربراہِ جماعتِ صادقین کا ساتھ دیا جب کوئی ساتھ دینے والا نہ تھا
اُس وقت ساتھ دیا جب نبیؐ کے مشن کو مالی امداد کی ضرورت تھی، جب نبیؐ کے ساتھ رہنے میں
مالِ غنیمت نہیں مل رہا تھا، اُس وقت ساتھ دیا جب ساتھ دینا گویا کانٹوں پر چلنا تھا، تلوار پر
گلا رکھنا تھا، اُس وقت ساتھ دیا جب راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی، اُس وقت ساتھ دیا جب
نبیؐ کی حفاظت کے لیے نبیؐ کے سونے کی جگہ کو ہر رات میں بار بار تبدیل کرنا پڑتا تھا اور آپؐ
کی جگہ اپنے بیٹے علیؑ کو سُلا دینا گوارہ کیا تاکہ دشمن نبی پر وار کر کے نقصان نہ پہونچا سکیں، ہر
امکانی خطرات سے آپؐ کی حفاظت کی اور اپنے فرزند علیؑ کی جان کی پروا بھی نہ کی۔ ایک عمر
تک ابوطالبؑ کا یہی معمول رہا۔

لیکن بعد میں جب نبیؐ کا ساتھ دینا، حصولِ مال، عزّت اور حکومت کا ذریعہ بننے

دیکھا تب لاکھوں ساتھی اور جاں نثار پیدا ہو گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان لاکھوں ساتھیوں میں نبیؐ کی پیروی و اطاعت کرنے والے چند ہی تھے۔ باقی صرف اصحاب کا لقب حاصل کرنے والے تھے۔ قرآن مجید میں ساتھی کہلانے کی ہدایت نہیں کی گئی ہے بلکہ پیروی کرنے کی ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے۔

لہٰذا بارگاہِ خداوندی میں صرف ان ہی کی قدر کی جائے گی جو پیروی کا حق ادا کریں گے نہ کہ صرف اصحاب کا لقب حاصل کرنے والوں کی۔ بہر حال جس نے جب اور جس مقصد کے پیشِ نظر نبیؐ کا ساتھ دیا ہو ان تمام لوگوں سے پہلے اگر کسی کی بے داغ مدد کرنے کا ذکر کیا جائے گا تو وہ ابو طالبؑ اور صرف ابو طالبؑ ہوں گے جنھوں نے نبیؐ کو اس وقت پالا جب دنیا کی نظر میں آپؐ کی حیثیت ایک یتیم کی تھی اس وقت پروان چڑھایا جب دنیا حضورؐ کو بنی ہاشم کا ایک جوان سمجھ رہی تھی، اُس وقت اپنے ساتھ رکھا جب خدیجہ بھی شریکِ زندگی نہیں تھیں۔ خدیجہ کی شرکت کے باوجود ابو طالبؑ کی محبت اور خبر گیری میں فرق نہ آیا۔ جب دنیا نبیؐ کی دشمن ہو گئی تو ابو طالبؑ نے مدد و نصرت میں اور اضافہ کر دیا۔ جیسے جیسے لوگوں کی عداوت بڑھتی جاتی تھی ابو طالبؑ کی اُلفت و ہمدردی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

ابو طالبؑ کو کسی مسلمان کی نظر بھلا کیا پہچان سکتی ہے۔ ابو طالبؑ کو اگر پہچاننا ہے، جاننا ہے، دیکھنا ہے اور سمجھنا ہے تو نبیؐ کی نظر سے دیکھو، نبیؐ کی نظر سے پہچانو، نبیؐ کے طرزِ عمل کے ذریعے جانو، نبیؐ کے انداز سے سمجھو اور دیکھو۔ ابو طالبؑ نے انتقال کیا تو نبی افسردہ ہیں، رنجیدہ ہیں، غمگین ہیں۔ یہ غم وقتی نہ تھا بلکہ اتنا لامحدود کہ نبی نے اُس سال کا نام ہی غم کا سال یعنی عام الحزن رکھ دیا۔ جس سال ابو طالبؑ نے انتقال کیا اُسی

سال نبیؐ کے غم میں اور اضافہ اُس وقت ہوگیا جب خدیجہؑ کا بھی انتقال پُرملال ہوگیا۔ نبیؐ نے خدیجہؑ
اور ابوطالبؑ دونوں کا برابر کا غم منایا۔ دونوں کے غم کے لیے سالِ وفات کو عام الحزن یعنی غم
کا سال قرار دیا۔ کیا نبیؐ، نبیؐ ہو کر بھی (معاذ اللہ) ایک کافر کا ماتم اس لیے کرتے ہیں کہ وہ
چچا تھے، ہمدرد تھے؟ جس نے ایسا سوچا اُس نے نبیؐ کو نہیں پہچانا، جس نے اس طرزِ عمل کے
باوجود (معاذ اللہ) ابوطالبؑ کو کافر کہا اُس نے ایک عظیم مردِ مومن کو کافر کہنے کا گناہِ عظیم
تو کیا ہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ توہینِ نبیؐ کا مجرم بھی ہے کیونکہ جو زندگی کے روابط پر
ترجیح کرے اور کفر و اسلام کا پاس و لحاظ نہ رکھے اُسے ہم مسلمان نہیں مانتے۔ پھر بانئِ اسلام
کے بارے میں جو شخص ایسے کمزور عقائد رکھتا ہو وہ توہینِ نبوّت نہیں کرتا تو اور کیا کرتا ہے۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ مرسلِ اعظم صرف مومن کا غم کر سکتے ہیں غیر مومن کا نہیں
نبیؐ جانتے تھے کہ میرے مخلص اور سربراہِ جماعتِ ایمانی چچا کو میرے دشمن کافر کہیں گے لہٰذا
آپ نے جناب خدیجہؑ اور جنابِ ابوطالبؑ کا یکساں غم منا کر بتا دیا کہ جو ایمانِ خدیجہؑ کی منزل
و مقام ہے وہی مقام و منزلتِ ایمانِ ابوطالبؑ ہے۔

جناب ابوطالبؑ کے درجۂ ایمان اور آپ کی عظیم ترین حمایت کے اثرات کو سمجھنے
کے لیے یہ بات بہت مدد دیتی ہے کہ حضورؐ نے اعلانِ اسلام کے بعد تیرہ سال مکّہ میں قیام
کیا، اس عرصہ میں آپؐ کے دس سال جناب ابوطالبؑ کے ساتھ گذرے اور تین سال جناب
ابوطالبؑ کے انتقال کے بعد حضورؐ مکّہ میں رہے۔ پہلے دس سال زیادہ سخت تھے اس لیے کہ
مسلمانوں کی تعداد اُس وقت بہت کم تھی۔ دشمن زیادہ تھے، نبیؐ کے مشن کا چرچا کم تھا اور دشمنوں
کی پھیلائی ہوئی افواہوں کا زور زیادہ تھا، پھر بھی حضورؐ مکّہ میں رہے اور دس سال رہے۔
مسلمانوں کی مدد بھی کرتے رہے، مسلمانوں سے مدد و نصرت کے طلبگار نہیں تھے ___ مگر

وفاتِ ابوطالبؑ کے بعد نبیؐ مکہ میں تین سال سے زیادہ نہیں رہ سکے جب کہ مسلمانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ اسلام کی تبلیغ مکہ سے باہر عرب کے شہروں میں زور پکڑ چکی تھی۔ مدینہ میں لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ سمندر پار حبشہ تک اسلام اور مسلمان پہونچ چکے تھے۔ مگر ان بہتر حالات کے باوجود صرف تین سال کے اندر نبی کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور خود مکہ چھوڑنے سے پہلے مسلمانوں کو محفوظ مقامات پر روانہ کرنا پڑا۔

معلوم ہوا کہ اکیلے ابوطالبؑ پوری تاریخِ عرب پر اس طرح بھاری تھے کہ تمام دوست واصحاب مل کر بھی نبیؐ کو اتنی قوت اور مدد نہ پہونچا سکے جتنی اکیلے ابوطالبؑ نے پہونچائی تھی کہ نبیؐ کو ابوطالبؑ کی زندگی میں مکہ نہیں چھوڑنا پڑا اور ابوطالبؑ کی وفات کے بعد مکہ میں نہ رہ سکے۔

اکیلے ابوطالبؑ سے طاقتور دشمن اس قدر مرعوب تھا کہ دس سال تک حضورؐ ان ہی دشمنوں کے درمیان کُھلّم کُھلّا تبلیغِ اسلام کرتے رہے اور دشمن آپ کا بال بیکا بھی نہیں کر سکا۔

ہاں ابوطالبؑ کے بعد شبِ ہجرت ابوطالبؑ کے بیٹے علیؑ نے بسترِ رسول پر بے خوف وخطر سو کر اور صبح کو دشمن کو خوف زدہ کر کے بتایا کہ ابوطالبؑ تو دنیا میں نہیں ہیں مگر اُن کا کردار دنیا میں زندہ ہے۔ اسی لیے شبِ ہجرت رات بھر مبارکباد دینے والے جبرئیلؑ و میکائیلؑ علیؑ کو مبارکباد دیتے رہے۔ مگر علیؑ کہہ کر مبارکباد نہیں دی، بلکہ فرزندِ ابوطالبؑ کہہ کر مبارکباد دی گئی تھی۔ نگاہِ مَلک علیؑ کی فداکاری میں کردارِ ابوطالب دیکھ رہی تھی۔ میرے بھائیو! کم از کم اتنا تو یاد رکھو کہ فرشتوں کی نگاہیں معصوم ہوتی ہیں وہ آدمی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتے۔

دُنیا میں اُن لوگوں نے بہت نقصان اُٹھایا ہے جنھوں نے دوست کو دشمن یا دشمن کو

دوست سمجھ لیا ہے۔ تاریخ کی مجرمانہ جانبداری ہے۔ جہاں نبیؐ کے دشمنوں کو نبیؐ کا دوست بنایا گیا ہے۔ مروان، ابوسفیان اور ان کے جرگے کو نبیؐ کا دوست کہنا، یزید اور اس کے جیسے افراد کو جانشینِ رسولؐ قرار دینا دیدہ و دانستہ غلطی ہے۔ ابوطالبؑ کو معاذاللہ کافر کہنا دوست کو دشمن سمجھنے کی مجرمانہ سازش ہے۔

ابوطالبؑ کو کل بھی پروانہ تھی کہ دنیا ان کو کیا کہتی ہے، اور آج بھی ان کی نصرتِ اسلام و نبیؐ انسانی مدح سے بے نیاز ہے۔ جن لبوں کو "ذکرِ محسن" کا شرف حاصل کرنا ہو، وہ مدحِ ابوطالبؑ کریں۔ کل صرف ابوطالبؑ اسلام کی مدد کر رہے تھے، آج پوری ایمانی تاریخ اولادِ ابوطالب کی احسان مند ہے جن کے خون نے شجرِ اسلام کی آبیاری کر کے حفاظتِ اسلام کی ہے۔ جب کبھی اسلام کے نام پر حکومت ملنے کا وقت آیا تو نئے نئے خاندان اُبھرے، لیکن جب کبھی اسلام کی حفاظت کا وقت آیا تو صرف اولادِ ابوطالبؑ ہی سامنے آئی جو اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی لائی۔ اولادِ علیؑ خواہ معصوم ائمہؑ ہوں یا سادات ہوں اور علیؑ کے دوست ہی تھے جو ہمیشہ اسلام کے آڑے وقت میں کام آتے رہے۔

واقعۂ کربلا گواہ ہے کہ حکومت کے تخت پر نبیؐ کے بدترین اور کھلم کھلا دشمن ابوسفیان اور مروان کی اولادیں قابض رہیں اور اسلام اور بانیٔ اسلام کی معصوم اولادوں کی بیخ کنی اور بربادی کی بھرپور کوششیں کرتی رہیں۔ کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں بھوک و پیاس کی غیر معمولی و ناقابلِ تصوّر تکالیف برداشت کر کے بخوشی موت کی طرف بڑھ رہے تھے اور خوشی و مسرّت ان کے فداکارانہ طرزِ عمل کو ظاہر کر رہی تھی کیونکہ ان کو یہ معلوم تھا کہ ہماری اس جاں نثاری پر اسلام کی بقا کا انحصار ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارا لہو جیسے دنیا زمینِ کربلا پر بہتا ہوا دیکھ رہی ہے وہ دراصل شجرِ اسلام کی جڑوں میں پہونچ رہا ہے۔ وہ جانتے تھے

کہ ہمارے اس خونِ ناحق کی سرخی، چہرۂ اسلام کو فروزاں کر رہی ہے وہ اسلام سے محبت میں
موت کو پیار کر رہے تھے۔ وہ پیاسے رہ کر سیلابِ ظلم وستم اور گمراہی کی بدبودار ہڈیوں کو توڑ رہے
تھے اور ہدایت کے پیاسوں کو سیراب کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے سروں کا نیزوں پر بلند ہونا
گوارا کیا تھا تاکہ پرچم اسلام ہمیشہ سربلند رہے۔ عباسؑ نے شانے کٹا کر اسلام کے بازو مضبوط کر دیے،
عَلَم کو سینہ سے سنبھال کر اسلام کے پھریرے کی سربلندی کی۔ صبح عاشور نمودار ہوئی، علی اکبرؑ نے اذان
دی، امامؑ نے نماز پڑھائی، اصحابِ باوفا اور اعزا نے امامؑ کے پیچھے آخری نماز صبح ادا کی۔
نمازی دعاؤں میں مصروف تھے کہ دشمنانِ نماز نے تیروں کی بارش شروع کر دی۔ حسینؑ کے اعزا
کو اصحابِ باوفا نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ خود سامنے کھڑے ہو گئے۔ پتھر کی دیواروں نے
اور فولادی دروازوں نے بارہا اپنے پیچھے پناہ لینے والوں کی تو حفاظت کی تھی لیکن آج اصحابِ حسینؑ
کے جسموں کی دیواریں بنی ہاشم کی حفاظت کر رہی تھیں۔ ان دیواروں میں تیر پیوست ہوتے جا رہے
تھے، خون بہہ رہا تھا مگر محافظ دیواریں اپنے امامؑ کی حفاظت میں تیروں کی تکلیف سے بے نیاز
اپنا فرض ادا کر رہی تھیں۔ نماز تمام ہوئی، سعید و زہیر اور مسلم ابن عوسجہ نے بھی اپنا فریضہ ادا کیا۔
تیر کھاتے کھاتے سعید اور مسلم ابن عوسجہ نے امامؑ کو آواز دی۔ مولا! ہم نے اپنی جانیں قربان کیں
ہماری خبر لیجیے اور آخری بار اپنی زیارت سے مشرف فرمائیے۔ امامؑ کے ساتھ تمام نماز گزار جمع
ہو گئے تھے ظلم نے تھک کر تیر باراں بند کی لیکن مظلوم ابھی باہمت تھے۔ یہ منظر دیکھ کر اصحاب میں
جذبۂ شہادت اور بڑھ گیا تھا۔ اس جوش میں قیامت کا اضافہ اُس وقت ہوا جب مسلم ابن عوسجہ کی
بیوہ نے اپنے کمسن بچے کی کمر میں تلوار باندھی اور یہ کہہ کر رخصت کیا: جا میرے فرزند دلبند تو بھی اپنے
مولا و آقا پر اپنی جان نثار کر دے، تیرا باپ تو اپنا حق ادا کر چکا۔ جا میرے لال جا، اپنی ماں کا ہدیہ
بن کر جا اور شہید ہو کر فاطمہؑ کی کنیز کو اپنی شہزادی کے سامنے سرخرو کر دے۔ فرزندِ مسلم اپنی ماں کا ہدیہ

ن کر خیموں کے درمیان سے گزر کر میدانِ جنگ کی طرف بڑھا۔ پلٹ کے ماں کو دیکھا جو شاید خیمے
کے پردے کو اٹھائے اپنے نورِ نظر کی ہمّت بڑھا رہی تھی۔

ماں کو الوداع کہہ کر بچّے نے امامؑ کی طرف اجازت لینے کے انداز میں دیکھا۔ امامؑ کی نظر برا
بچّے کے ساتھ ساتھ تھیں۔ آپ نے آواز دی فرزند کہاں جا رہے ہو؟ کس کی نشانی ہو؟

بچّے نے عرض کیا جس کی لاش آپ کے سامنے ہے اسی مسلم کا فرزند ہوں، ماں نے بھیجا
ہے۔ باپ کے نقشِ قدم پر چل کر آپ پر قربان ہونے جا رہا ہوں۔ مولا! میں آپ کے دشمنو
سے لڑوں گا، مر جاؤں گا مگر آپ کے دشمنوں کو زندہ نہ دیکھوں گا۔

امامؑ نے بچّے کو واپس بُلا لیا۔ ماں خیمے سے باہر نکل آئی اور عرض کرنے لگی: مولا!
یہ میرا ہدیہ ہے، قبول فرمالیجیے۔

امامؑ کے حکم پر بچّہ واپس ہو گیا، ماں کا ہدیہ قبول ہو گیا۔ امامؑ کو گوارا نہ تھا کہ میری زندگی
میں کسی بچّے کو زخم پہونچے، مگر مسلم کے فرزند کی حفاظت کرنے والے امامؑ کو اپنے چھ مہینے
کے لال کی نازک گردن سے تیرِ سہ شعبہ کو خود کھینچنا پڑا۔ لاش کو سینے سے لگا کر سنبھالنا پڑا
تیر نکالتے وقت امامؑ نے اصغر کی بند آنکھیں دیکھیں، گلے کا زخم دیکھا، خون میں ڈوبا ہو
کُرتہ دیکھا، زخم سے ٹپکتا ہوا خون دیکھا، چُلّو لگا دیا۔ جب چُلّو بھر گیا تو خون چہرے پر مَل لیا
حسینؑ کے زخمی دل کو تسلّی دینے والا کوئی نہ تھا۔ مظلوم نے خود ہی نانا کو پکارا اور نانا ہی کو
گواہ بنایا کہ میں اپنے کمسن فرزند کا خون چہرے پر مَل کر خدا کی بارگاہ میں جا رہا ہوں۔ کوئی با
آج تک اس طرح اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر نہ ہوا ہوگا۔ حسینؑ نانا کو پکار کر خاموش ہو گئے
اب باپ کی نگاہ اصغر کی لاش پر تھی اور خدا حسینؑ کو دیکھ رہا تھا۔

پانچویں مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَا اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ ہ

(سورۃ التوبۃ آیت ۔ ۱۱۹)

" اے ایمان والو! تمہارا فرض ہے کہ اللہ سے ڈرو، یعنی تقویٰ اختیار کرو اور سچوں (صادقین) کے ساتھ ہو جاؤ "۔

معلوم ہوا سچوں کی کوئی جماعت ہے جن کے ساتھ ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ دنیا میں صرف ایک بار سچ بولنے والے کو اُس وقت تو سچا کہہ سکتے ہیں مگر اُس کی مکمل پیروی کا حکم دنیا میں کوئی بھی نہ دے گا جس سے جھوٹ کا امکان اور خطا کا اندیشہ ہو۔ بندہ چاہے پیروی کا حکم دے دے لیکن اللہ ایسے ناقص کے اتباع کا حکم نہیں دے گا۔ صادقین وہ نہیں ہیں جو زندگی میں صرف ایک بار سچ بولیں۔ صادقین وہ ہیں جو سوتے جاگتے زندگی کے لمحے میں کسی مرحلے میں کبھی جھوٹ نہ بولے ہوں۔ اب مجھے دنیا بتائے کہ نبیؐ اور اولادِ نبیؐ یعنی اہلِ بیتِ پیغمبرؐ کے علاوہ وہ کون ہیں جو صادقین کی منزل میں آتے ہوں۔ ایسے سچے کہ اگر انگلی اُٹھا دیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں، ہاتھ اُٹھائیں تو ڈوبا ہوا آفتاب پلٹ آئے، اشارہ کر دیں تو ستارہ اُتر آئے، آواز دیں تو درخت اپنی جگہ چھوڑ کر چلا آئے۔

یہ بھی علیؑ اور اولادِ علی ہی ہے پیغمبرؐ جن کو مباہلہ کے لیے نصاریٰ نجران کے مقابلہ میں لے گئے
جن کو دیکھ کر عیسائیوں نے کہا تھا کہ ہم وہ چہرے دیکھ رہے ہیں کہ یہ اگر پہاڑ کو اشارہ کر دیں تو وہ
بھی چلتے نظر آئیں۔ اس کے باوجود وہ لوگ ایمان نہ لائے کیوں کہ ان کا آبائی دین تباہ ہوتا ہے
اور اِدھر سچّوں کی تصدیق بھی ہوتی تھی۔ اب نہ کہیے کہ علیؑ اور اولادِ علیؑ کو دنیا نے کیوں چھوڑا۔؟
حالانکہ ان حضرات کی صداقت اسی وقتِ محدود تک نہ تھی بلکہ آج اس سچائی و حق گوئی کے اثرات
بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ آپ جب چاہیں تجربہ کر لیں۔ یومِ حسینؑ مقرر کریں اور ہر مکتب فکر کے افراد کو
مدعو کریں تاکہ وہ حسینؑ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہر شخص حسینؑ کی
سچائی و صداقت دم بھرتا نظر آئے گا۔ یعنی کسی کا عقیدہ کچھ بھی ہو، مذہب کچھ بھی ہو، چاہے عیسائی ہو
یا کمیونسٹ اس کے باوجود حسینؑ کے کردار کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ بس یہی صداقت ہے اور
انھیں کو سچا کہا جاتا ہے حسینؑ کا مذہب مانیں یا نہ مانیں لیکن حسینؑ کو صادق ماننے سے انکار نہیں کرتے

یہاں تک تو بات آسان تھی۔ اب ذرا مجھے گہرائی میں اُترنا ہے، کہ عیسائی جب حسینؑ
کی تعریف کرتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ محمدِ عربیؐ نے جو مذہب پیش کیا تھا وہ مذہب حق تھا جس پر حسینؑ نے
جان دی، بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ حسینؑ نے انسانیت کی مدد و نصرت کی، حسینؑ نے انسانیت کو بچایا، حسینؑ
نے اپنی اور اعزّا، و اصحاب کی قربان دے کر آدمیت کو باقی رکھا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ دنیا
کہتی ہے کہ حسینؑ سچے ہیں حالانکہ حسینؑ تب ہی سچے ہوں گے جب اسلام سچّا ہوگا، جس کی سچّائی
حسینؑ نے قربانیاں پیش کیں، جو حسینؑ کو سچا کہتا ہے وہ دراصل اسلام کو سچا کہتا ہے۔ مگر جب
غیر مسلم حسینؑ کو صادق کہتا ہے تو اسلام کا نام نکال دیتا ہے اور کہتا ہے کہ حسینؑ نے انسانیت کی
خدمت کی ہے۔ آخر غیر مسلم یہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ اسلام ہی انسانیت ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے
تاریخِ خلفاء کے ذریعے بہت سے بگڑے ہوئے مسلمانوں کا کردار ہے جس کی بنا پر اُس نے سچ

کہ اسلام ان بگڑے ہوئے لوگوں کے مذہب کا نام ہے اور جس پر حسینؑ نے قربانیاں پیش کی ہیں اُس کا نام انسانیت ہے۔

لہذا اگر غلط طریقہ سے اسلام نہ پیش کیا گیا ہوتا تو آج حسینؑ کا نام ساری دنیا ئے اسلام کی سچائی کی گواہی میں پیش ہوتا۔ لیکن افسوس کی بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ دنیا میں کوئی نہیں ملتا جو حسینؑ کی مخالفت کرے، یعنی دہریہ حسینؑ کا مخالف نہیں، کیمونسٹ حسینؑ کا مخالف نہیں، غیر مسلموں میں، بُت پرستوں اور عیسائیوں میں حسینؑ کے مخالف نہیں ہیں، اُن کے مخالف آج بھی لاالٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ کہنے والے ہی ہیں قرآن کو سینے سے لگا کر حسینؑ کی مخالفت کرنے والے ملیں گے۔

غور فرمائیں اور مجھے کہنے کی اجازت دیں کہ حسینؑ کربلا کے میدان میں بھی کسی بُت پرست، مجوسی، یہودی اور عیسائیوں سے نبرد آزما نہیں تھے بلکہ کردار کے بگڑے ہوئے مسلمانوں نے ہی حسینؑ سے جنگ کی تھی۔ بس جیسا مسلمان کل کربلا میں حسینؑ کا مخالف تھا آج بھی اسی کردار کا مسلمان حسینؑ، حسینیت اور اسلام سے نبرد آزما ہے۔ کوئی سال ایسا نہیں گزرتا کہ عزائے حسینؑ پر اعتراضات نہ کیے جاتے ہوں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ حسینؑ سے محبّت کرو، ہم بھی حسینؑ سے محبّت کرتے ہیں۔ اُن کے مصائب پڑھو مگر دل پر اثر لو، آنکھوں سے آنسو مت بہاؤ، مظاہرہ نہ کرو۔ یہ ایک غیر فطری نیا فلسفہ ایجاد ہوا ہے کہ دل روئے آنکھوں سے آنسو نہ نکلنے پائیں۔ کہا جاتا ہے کہ، ہم منع نہیں کرتے حسینؑ کا تذکرہ کیجیے مگر زبان سے اظہارِ غم نہ کیجیے، سڑکوں پر ماتم نہ کرو۔ گھروں میں بیٹھ کر ہائے ہائے کی آوازیں کیوں بلند کرتے ہو؟ یہ فلسفہ کیوں بدلتا جا رہا ہے؟ اصول تو وہ ہیں جو اپنی جگہ پر قائم رہیں۔

اصول بدلا نہیں کرتے، آئیے ایک مثال دوں۔ کہا جاتا ہے حسینؑ کو دل سے چاہو،

حسینؑ کو دل سے رووٗ، ظاہر کیوں کرتے ہو۔ مثال سُنیے: دوست سے ملاقات ہوئی، دل میں رکھیے دوستی کو، مسکرانے کی ضرورت نہیں، کسی عزیز کے مرنے کی اطلاع آئی، چہرے کا رنگ بدلنے نہ پائے دل ہی پر اثر رہے۔ دنیا نے کہا نہیں اگر مسرت ہوگی تو چہرہ سُرخ ہو جائے گا، اور اگر غم ہوگا تو چہرہ رنجیدہ اور زرد ہو جائے گا۔ معلوم ہوا فطرت جب تک اظہار نہیں کر لیتی تب تک راضی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ساری مثالیں ہیں۔ مریض جب درد سے کراہتا ہے، کیا آہ کرنے سے درد چلا جاتا ہے۔ نہیں درد تو نہیں جاتا مگر مریض جو درد میں مبتلا ہے جب تک اس درد کا مظاہرہ کراہنے سے نہیں کر لیتا اُس وقت تک درد والے کو سکون نہیں ملتا۔ اسپتالوں میں جا کر تم نے مریضوں سے کبھی نہیں کہا کہ درد ہے یا تکلیف ہے، تو اس کو دل میں رکھو کراہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم سے آکر کہتے ہو کہ تمھارے دل پر کربلا کے بہتّر (۷۲) شہیدوں کا غم ہے مگر رونے اور کراہنے یا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ افسوس صد افسوس یہ کیسا انصاف ہے کہ جسمانی درد پر کراہنے کی اجازت ہے مگر روحانی اذیّت و کرب پر کراہنے یا رونے کی پابندی ہے۔

مذہبی مثالیں تو بہت آسان ہیں۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ کل جناب ابراہیمؑ نے جو قربانی دی تھی اس قربانی میں جناب اسمٰعیل اور جناب ہاجرہؑ نے بھی حصّہ لیا تھا۔ آج تک خدا نے حج کی شکل میں اس قربانی کی یاد باقی رکھی ہے۔ جو جناب ہاجرہ نے کیا تھا وہ بھی حاجی کو کرنا پڑتا ہے، جو جناب ابراہیمؑ نے کیا وہ بھی حاجی کو کرنا پڑتا ہے، جو جناب اسمٰعیل نے کیا تھا وہ بھی حاجی کو کرنا پڑتا ہے۔ مجھ سے آپ کہتے ہیں کہ مظاہرۂ غم نہ کرو، کربلا کی یادگار نہ مناوٗ۔ ارے خدا سے کہو، پالنے والے تیرے بندہ ابراہیمؑ نے قربانی دی تھی تو نے قبول کر لی۔ تیری کنیز ہاجرہ نے قربانی دی تھی تو نے قبول کر لی۔ بس تیرے یہ بندے

نیں اور تو جانے، یہ ہم سے یادگار کیوں منوا رہا ہے۔
جس واقعے میں تین آدمیوں نے مل کر قربانی دی تھی اگر وہ واقعہ اس قابل ہے کہ
ر سال مسلمانوں میں حج کی صورت میں اُس کی یادگار منائی جائے تو واقعۂ کربلا جس میں
ک دوپہر میں بہتّر قربانیاں اسلام کی بقاء کی خاطر بارگاہِ خداوندی میں پیش کی گئی
وں اس کی یادگار کیوں نہ منائی جائے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو ظلم کرتا ہے وہ ظالم کا
امی ہوتا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ مظلوم کی یادگار قائم ہو۔ ایک چھوٹا سا واقعہ یاد دلا دوں۔
ظالموں نے یحییٰؑ بن زکریاؑ کو قتل کیا۔ یحییٰ مظلوم قتل ہو گئے۔ زمین پر خون بہا۔ دنیا
بھی معمولی خون ہے بہہ کر خشک ہو جائے گا۔ مگر قدرت نے آواز دی، ظالمو! میں مظلوم کی
یادگار بناؤں گا۔ لہٰذا جہاں جناب یحییٰ کا خون بہایا گیا تھا وہاں پر زمین سے خون اُبلنے لگا۔
قاتلوں نے جب دیکھا کہ خون مسلسل اُبل رہا ہے، مظلوم یحییٰؑ کی یادگا بن رہی ہے تو جلدی جلدی
مٹی ڈالنے لگے۔ پتہ چلا کہ ظالم ظلم کرنے کے بعد مظلوم کی یادگار کو مٹانا بھی چاہتا ہے۔
مٹی ڈالی کہ یحییٰ مظلوم کا خون چھپ جائے مگر قدرت نے کہا، ظالم! تیری طاقت یہی
ہے کہ مٹی ڈالتا جائے اور میری قدرت یہ ہے کہ میں تیری ہر کوشش کے باوجود مظلوم کی یادگار
کو بلند کرتا جاؤں۔ جتنی مٹی ڈالی گئی اُتنا ہی خون اُبلتا گیا۔ خدا یادگار بنانے پر مُصر، قاتل
یادگار مٹانے پر آمادہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جناب یحییٰؑ کی قتل گاہ نشیب میں تھی لیکن مٹی ڈالی جاتی رہی
تو وہ اُبھر کر ایک بڑا ٹیلا بن گئی۔ اگر دشمن چھپانے کی کوشش نہ کرتا تو یحییٰؑ کی یادگار زمین ہی
سے لگ کر رہ جاتی، مگر جیسے جیسے ظالم مخالفت کرتا گیا ویسے ویسے یادگار بھی بلند ہوتی گئی۔
عزائے حسینؑ کی مخالفت کرنے والے اس مثال سے سبق حاصل کریں۔ وہ جتنی مخالفت کریں گے
یادگار اتنی ہی اونچی ہوتی چلی جائے گی۔ اب زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہنا

چاہتا ہوں کہ یہ اپنا اپنا نصیب ہے۔ کوئی حسینؑ کی عزاداری کی مخالفت کرتا ہے اور کوئی حسینؑ کی عزاداری پر جان چھڑکتا ہے اور میرے دل سے دعا نکلتی ہے: پالنے والے! ان کو سلامت رکھنا جو تیرے مظلوم بندے حسین کے ماتم میں چار چاند لگا رہے ہے۔ میرے مالک! اُن گودیوں کو آباد رکھنا جن میں تیرے حسینؑ کے عزادار پل رہے ہیں۔ مالک اُن گھروں کو باقی رکھیو، جن گھروں سے حسینؑ پر رونے کی آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

بس آپ کے سامنے مصائب ہی پڑھنا چاہتا ہوں۔ اللہ جانے ہم میں سے کون اگلے سال زندہ رہے گا اور کون نہیں رہے گا۔ مالک! تو جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ لہٰذا اے کریم! تجھے حسینؑ کی عزاداری ہی کا واسطہ کہ اے معبود! اگر ہمیں زندہ رکھنا تو حسینؑ کا ماتم دار بنا کر ہی رکھنا، اور پالنے والے! اگر ہم میں سے کسی کو موت دینا تو اتنی مہلت دینا کہ حسینؑ کا ماتم کر سکیں۔

عاشور کی شب بھی ایک شب تھی، دنیا میں اس جیسی شب نہ تو پہلے کبھی آئی تھی اور نہ آئندہ آئے گی۔ یہی وہ شب تھی کہ جس میں تین شب و روز کے بھوکے پیاسوں نے جلتی ریتی پر تیمّم کر کے رات بھر نمازیں پڑھیں۔ اور اتنا دل لگا کر نمازیں پڑھیں کہ چھوٹے چھوٹے بچّوں کی آوازیں آ رہی تھیں العطش، العطش، (ہائے پیاس، ہائے پیاس)۔ ارے پیاس مارے ڈالتی ہے۔ مگر باپ سجدہ میں پیشانی رکھ کر کہہ رہا تھا سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہٖ اور درِ خیمہ پر بچّہ آواز دے رہا تھا، بابا! میں پیاسا ہوں۔ مگر بچّے سے بے نیاز نمازی اپنے سجدۂ آخر میں مصروف تھے، یہ تھے کربلا کے نمازی۔ رات گزر گئی صبح ہوئی۔ وہ صبح کہ قیامت کی صبح بھی اس کے سامنے ہیچ تھی۔ آج آفتاب بھی نکل رہا تھا تو اُس کا چہرہ بھی سُرخ نہیں زرد تھا اس لیے کہ اسے احساس تھا کہ اب تک میں نے جو کچھ نہ دیکھا تھا وہ آج دیکھنا پڑے گا۔ اُسے معلوم تھا

کہ اب تک تو حسینؑ ہی کو دیکھا تھا آج اُن کی پائمال شدہ لاش بھی دیکھنا پڑے گی۔ اب تک تو علی اصغرؑ کو دیکھا تھا لیکن آج اُن کا چھدا ہوا گلا بھی دیکھنا ہوگا۔ آج تک علی اکبرؑ کی جوانی دیکھی تھی لیکن آج اُن کے کلیجے میں نیزے کا پھل بھی دیکھنا پڑے گا۔ اب تک عباسؑ کو دیکھا تھا آج اُن کے کٹے ہوئے شانے دیکھنا پڑیں گے۔ اب تک خیمے دیکھے تھے اور آج جلتے ہوئے خیمے اور سیدانیوں کو کھُلے سر بھی دیکھنا پڑے گا۔

آفتاب نکلا، مظالم دیکھے، حسینؑ کا گلا کٹتے دیکھا۔ مگر جب خیمے جلنے لگے اور آلِ زہراؑ سر برہنہ نکلنے لگی تو آفتاب کو یاد آیا۔ ارے زینبؑ اُس علیؑ کی بیٹی ہے جس کی نماز کے لیے مجھے غروب ہونے کے بعد طلوع ہونا پڑا تھا۔ کہنے لگا، اے میری شہزادی میرے پاس کوئی چادر ہوتی تو تیرے سر پر ڈال دیتا۔ لیکن اے علیؑ کی بیٹی! لے میں گہن کی چادر سے اپنا چہرہ چھپائے لیتا ہوں تا کہ تیرا پردہ باقی رہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ الم ناک واقعہ، واقعۂ کربلا ہے، اور کربلا کے دردناک دنوں میں سب سے زیادہ دردناک دن عاشور کا ہے اور عاشور کے دن سب سے زیادہ الم ناک وقت عصرِ عاشور ہے۔ مصیبت کا تو پورا دن عاشور کا دن تھا۔ ہائے کیسی مصیبت تھی کہ کبھی حبیبؑ کی لاش آرہی ہے، کبھی ابو ثمامہ کا جنازہ آرہا ہے، کبھی جونِ حبشی موت کی تیاری کر رہے ہیں۔ کبھی عباسؑ جا رہے ہیں، کبھی علی اکبرؑ تیاری میں مصروف نظر آرہے ہیں، اور کبھی حسینؑ، علی اصغرؑ کی ننھی سی لاش کو سپردِ خاک کر رہے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ ہنگام عصر بھی آپہونچا کہ جب حسینؑ اپنا وعدہ پورا کرنے کی تیاری کے لیے خیمے میں تشریف لائے، بہن کو بُلایا اور فرمایا، ماں جائی میرا پُرانا کُرتہ لاؤ، وہی کُرتا جو میری ماں نے سیا تھا۔ زینبؑ نے کہا کیوں بھیا؟ ۔ فرمایا، اس لیے کہ میری ماں کی وصیت بھی تھی، اور مجھے

پنے لباس کے نیچے پہننا ہے کیونکہ میرے مرنے کے بعد ظالم میرا لباس تک نہ چھوڑیں گے ور وہ کرتہ بہت پُرانا سمجھ کر ممکن ہے اُسے جسم سے نہ اُتاریں اور میری لاش برہنہ نہ رہنے پائے۔

میرا دل کہتا ہے کہ یہ لباس زینبؑ، حسینؑ کو نہیں دے رہی تھیں بلکہ یہ بہن اپنے بھائی کو کفن دے رہی تھیں۔ جب میرا مولا لباس تبدیل کر چکا تو فرمایا، اے بہنو! بیبیو! اور بچّو! تم بھی اسیر ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اعلانِ اسیری کر کے حسینؑ اُس خیمے کی طرف چلے جس میں بستر بیماری پر سیّد سجادؑ پڑے تھے، آئے اور بیٹے سے رخصت ہو کے چلے اور حسینؑ کو رخصت کرنے والے پیچھے پیچھے چلے۔ بتاؤں وہ کون تھے؟ وہ یتیم بچے اور کچھ لاوارث بیوہ عورتیں۔ خیموں سے گزر کر حسینؑ باہر تشریف لائے اور ایک بار پھر آپ نے فرداً فرداً سب پر نظریں دوڑائیں، جس پر بھی نظر پڑتی تصوّر میں اس کی اسیری اور پریشانی سامنے آجاتی۔ بچّوں میں جب سکینہ پر نظر پڑی تو خیال آیا کہ میرے بعد طمانچے کھائے گی، زینبؑ پر نظر پڑی تو خیال آیا کہ بازوؤں میں رسّی باندھی جائے گی رباب پر نظر پڑی تو خیال آیا کہ مشکیں کسی جائیں گی۔

الغرض ایک ایک کی اسیری اور مصیبت نظروں میں تصویر کی طرح پھر گئی، سکینہؑ کو تسلّی دی اور خدا حافظ کہا، فضّہ کو دیکھا، تسلّی دی اور فرمایا، اے فضّہ! جسے تو نے جھولا جھلا تھا آج وہ موت کے جھولے میں جا رہا ہے۔ حسینؑ ایک ایک سے رخصت ہو رہے ہیں۔

عزادارو! مگر رخصت کر کے جسے دیکھا بے چین پایا۔ مگر زینبؑ حسینؑ کی شیدا بہن زیا پریشان تھیں۔ حسینؑ نے دل میں کہا ہوگا تم تو مرنے جا رہے ہو اور یہ قافلہ زینبؑ کے سہا چھوڑ کر جا رہے ہو۔ اے حسینؑ! اگر زینب اتنا بے چین رہی تو قافلہ کو کون سنبھالے گا، حسی

مرنے کے لیے بعد میں جانا پہلے زینبؑ کا دل سنبھالو۔ یہ سوچ کر حسینؑ آگے بڑھے اور فرمایا
اے زینبؑ! میری ماں جائی تیرا بھائی مرنے جارہا ہے۔ یہ کہنا تھا حسینؑ کا کہ زینبؑ کی آنکھ
سے آنسو برسنے لگے۔ حسینؑ نے بہن سے کہا، اے بہن میں مرنے جارہا ہوں لیکن تم اپنے
بھائی کو خوشی سے رخصت کرو۔ زینبؑ نے کہا بھیّا، کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی بہن نے
اپنے بھائی کو موت کے لیے خوشی سے رخصت کیا ہے۔ حسینؑ نے فرمایا، اے بہن، اگر تم
مجھے خوشی سے رخصت نہ کروگی تو حسینؑ قاتل کے خنجر کے نیچے جب تمھارا چہرہ دیکھے گا تو
بے چین ہو جائے گا، اور اگر خوشی سے رخصت کروگی تو حسینؑ مسکرا کے گلا کٹائے گا۔
زینبؑ! کیا چاہتی ہو۔ تیرا بھائی مُسکرائے یا تڑپے۔؟

زینبؑ نے آنسو پونچھے، خیمے کا پردہ اُٹھایا۔ بھیّا جاؤ۔ قنات کے پاس حسینؑ کا رہوار
کھڑا تھا۔ امامؑ فرس پر سوار ہونے کے بجائے دائیں اور بائیں دیکھنے لگے۔ زینبؑ نے کہا
بھیّا، اب تو نہ اکبرؑ ہیں نہ عباسؑ جو آپ کو سوار کرائیں۔ فرمایا، ہاں بہن جب میں سوار ہوتا
تھا تو اکبرؑ و عباسؑ رکاب تھام لیتے، قاسم گھوڑے کی لگام پکڑتے تھے۔ اے زینبؑ!
اب کوئی نہ رہا۔ زینبؑ نے کہا، بھیّا، نہ گھبرائیے۔ اب تمھاری بہن زینبؑ تمھیں سوار
کرائے گی۔ زینبؑ نے ایک ہاتھ سے رکاب تھامی، ایک ہاتھ سے حسینؑ کا بازو پکڑا۔
حسینؑ کو سوار کیا۔ حسینؑ نے چاہا کہ گھوڑے کو آگے بڑھائیں مگر خیال آیا میرے پیاسے
گھوڑے میں نے بڑی تکلیف دی ہے مگر اس کے بعد تکلیف نہ دوں گا۔ یہ میرا آخری
سفر ہے۔ اے میرے وفادار گھوڑے قدم اُٹھا۔ یہ کہہ کر حسینؑ نے لگام کو جنبش دی،
لیکن گھوڑے نے قدم نہیں اُٹھایا، قدم اُٹھانے کے بجائے ایک مرتبہ سر اُٹھا کر حسینؑ کو
دیکھا اور سر جُھکا کر اپنے پیروں کی طرف اشارہ کیا۔ اب امامؑ نے جو دیکھا تو سکینہؑ گھوڑے

کے پیروں سے لپٹی ہوئی کچھ کہہ رہی ہے۔ ممکن ہے سکینہؑ کہہ رہی ہوں گی' اے بابا کے رہوار
میرے بابا کو نہ لے جا، بابا کو نہ لے جا، میں یتیم ہو جاؤں گی۔

حسینؑ گھوڑے سے اُترے، بچّی کو کلیجے سے لگایا، پیار کیا اور جس نے مدینہ سے
چلتے وقت اصغرؑ کے کان میں کچھ کہا تھا، سکینہ کے کان میں بھی کچھ کہا۔ جس کے سُنتے ہی
سکینہؑ نے کہا، بابا، اب میں آپ کو نہ روکوں گی، آپ جائیے، مگر ایک بار مجھے سینے سے
لگا لیجیے، کیونکہ آپ کے بعد سکینہؑ یتیم ہو گی تو سر پر ہاتھ رکھنے والا بھی نہ ہوگا۔ بابا پہلے
میرے سر پر ہاتھ رکھ دیجیے۔

حسینؑ نے سکینہؑ کی فرمائش پوری کی، سر پر ہاتھ بھی رکھا، سینے سے بھی لگایا اور
پھر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اب جو چلے تو سکینہؑ سے کہا، بیٹی! خدا حافظ، سکینہؑ نے بھی
بابا کو خدا حافظ کہا۔

چھٹی مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ: اذا جاء نصر اللہ والفتح..........

(سورۃ النصر آیت۔ ۱)

"(اے میرے پیغمبرؐ!) جب اللہ کی مدد آجائے گی اور فتح حاصل ہو جائے گی، تو لوگوں کو فوج در فوج خدا کے دین میں شامل ہوتے ہوئے دیکھو گے۔"

قرآن مجید نے لوگوں کے دینِ خدا میں بکثرت شامل ہونے کی جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ حضورؐ کی زندگی ہی میں پوری ہونے لگی تھی کہ سارا عرب مسلمان ہو گیا تھا اور عرب کے پڑوسی ملکوں میں اسلام پھیلنے لگا تھا۔ مگر جس طرح مکان بنانے والا مکان بنتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مگر اس خوشی کے ساتھ اس کو یہ فکر بھی رہتی ہے کہ مکان کی تعمیر میں کوئی کمزوری نہ رہ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ جب منزلیں اوپر جائیں تو دیواریں گرنا شروع ہو جائیں، اسی طرح پیغمبرؐ کو بھی فکر تھی کہ اسلام جس تیزی سے پھیل رہا ہے بعد میں کہیں اُسی تیزی سے ہٹنا شروع نہ ہو جائے۔ مکان کے گرنے کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کبھی دشمن اُسے گرا دیتا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مکان کی اینٹیں اپنی جگہ سے ناپائیداری کی وجہ سے ہٹنا شروع ہو جاتی ہیں جس کی بنا پر دیواریں پھٹنا اور چھت گرنا شروع ہو جاتی ہیں اور

اس طرح پورا مکان منہدم ہو جاتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کو کبھی تو کافروں نے مٹانا چاہا اور کبھی اس کے ماننے والوں نے اپنی مرضی کے مطابق بدلنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ نبیؐ کے سامنے دینِ اسلام کی پوری گذشتہ تاریخ تھی جس میں دین کو مٹانے کی دونوں کوششوں کے نمونے موجود تھے۔

فرعون اور یہودیوں نے جناب موسیٰؑ و جناب عیسیٰؑ سے لڑ کر دین مٹانا چاہا۔ مگر جب یہ کھلے ہوئے دشمن نبیؐ کی زندگی میں دین نہ مٹا سکے تو تاریخ نے یہ بھی بتایا کہ جناب موسیٰؑ اور جناب عیسیٰؑ کی امت نے اپنے نبیؐ کے بعد دین بدل ڈالا اور اس قدر دین میں تحریف کر دی کہ اصل دین ختم ہو گیا۔

حضورؐ بھی دیکھ رہے تھے کہ مشرکینِ مکّہ اور قبائلِ عرب مکّہ میں بدر، اُحد اور خندق و خیبر وغیرہ میں دین کو مٹانے کی کھُلّم کھُلّا کوشش کر چکے ہیں اور ناکامیاب ہو چکے ہیں۔ اب ایک ہی خطرہ باقی تھا کہ کہیں میری ہی اُمّت میرے بعد دین کو نہ بدل ڈالے۔

حضورؐ سے پہلے جتنے نبی آئے تھے سب کو یہ اطمینان تھا کہ اُن کے بعد اور بھی نبیؐ آئیں گے جو دین کی حفاظت کریں گے، جو دین کو ازسرِ نو زندہ کریں گے۔ مگر حضورؐ کو معلوم تھا کہ میں آخری نبیؐ ہوں میرے بعد کوئی نبیؐ نہیں آئے گا اور میرے دینِ اسلام کو قیامت تک باقی بھی رہنا ہے، لہذا اسلام جس قدر ترقی کرتا جا رہا تھا اسی قدر سرورِ کائنات کی یہ فکر بھی بڑھتی جا رہی تھی کہ دین کے قیامت تک باقی رہنے کا انتظام کر دیں۔

اُحد و خندق میں نبیؐ دکھا چکے تھے کہ جب سب مدد کرنے کے بجائے بھاگ کھڑے ہوں یا مدد کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھے رہیں تو اُس وقت علیؑ اور صرف علیؑ ہوتے تھے جو نہ بھاگتے اور نہ مدد کرنے سے بیٹھ رہتے تھے۔ اسی طرح خیبر میں بھی نبیؐ دکھا چکے

تھے کہ جن کو لوگ میرے بعد اسلام کی مکمل پیشوائی اور خلافت کا عہدہ سونپنے والے ہیں جب وہ لشکرِ اسلام کے سردار بن جاتے ہیں تو جہاد کے بجائے اپنے عمل سے مسلمانوں کو فرار کا عادی بنا دیتے ہیں۔ مگر جب فرار کے عادی لشکر کا سردار میں علیؑ کو بناتا ہوں تو لشکر بھی اپنی عادت کے برخلاف علیؑ کی قیادت میں جم کر لڑتا ہے۔

غرض کہ نبیؐ جن علیؑ کو اپنے بعد محافظِ اسلام، اُمّت کا قائد اور اپنا جانشین مقرّر کر رہے تھے اُن علیؑ کے اور اُن کے مخالفوں کے کردار کے عملی نمونے اُمّت کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ اس کے بعد اگر مسلمان اسلام پر قائم رہتے اور حکومت کے بہی خواہ ہونے کے بجائے نبوّت کے خیر خواہ ہوتے تو حکمِ خدا و رسولؐ کے بعد علیؑ کو اور صرف علیؑ کو نبیؐ کے بعد اپنا قائد اور نبیؐ کا جانشین مانتے، مگر لالچ کے سیلاب میں سب بہہ گئے اور سیلابِ طمع سب کچھ بہا لے گیا۔ ایمان تو درکنار اسلام بھی ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ ماننے کے بجائے علیؑ اور ان کی معصوم اور غیر معصوم نسل یعنی ائمہؑ اور سادات کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ علیؑ کے دوست بھی محفوظ نہ رہے۔ مدینہ کی حکومت سے لے کر بنی امیہ و بنی عبّاس کی حکومتوں تک یعنی کئی سو سال تک یہ قتلِ عام جاری رہا۔ یہاں تک کہ ظلم کے خنجر کُند ہو گئے مگر گلا کٹانے والوں کی ہمّت شکستہ نہ ہو سکی اور ہمّت شکستہ ہوتی بھی کیسے جب خود ائمہؑ قربانیاں دے رہے تھے۔ شہداء کے حوصلے پست کیسے ہوتے جب وہ دیکھ رہے تھے کہ فاتحِ خیبر صاحبِ ذوالفقار علیؑ کے سامنے اُن کا گھر جل رہا تھا، اُن کے سامنے بنتِ رسول ام الائمہؑ فاطمہ زہراؑ زخمی ہو رہی تھیں مگر علیؑ صابر و شاکر تھے۔

غرض کہ علیؑ سے لے کر حسینؑ تک کی تاریخ نے اُس پُر حوصلہ قوم کو عزم دیا تھا جس کے پیاسوں نے کربلا میں وہ کر دکھایا جس کو سوچ کر آج تک بشریتِ عالم حیرت میں ڈوبی ہوئی

ہے۔ غمِ حسینؑ میں بہنے والے آنسو اُن پیاسوں کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں جنھوں نے صبر کا وہ غیر معمولی مظاہرہ کیا کہ تین دن کی بھوک اور پیاس میں ایک کے بعد ایک شہید ہوتا گیا، مگر جوشِ شہادت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اصحاب نے پوری کوشش کی کہ پہلے ہم قربانی پیش کریں تاکہ بنی ہاشم کی کوئی فرد بھی اُن کے سامنے زخمی نہ ہونے پائے۔

میں سوچتا ہوں کہ امامؑ نے اصحاب کو بنی ہاشم سے پہلے شہادت کی اجازت کیوں دی۔ اگر امامؑ روک دیتے تو اصحاب دل پر جبر کرتے، مگر رُک جاتے۔ اصحاب اپنی فداکاری، جاں نثاری اور بے مثال وفاداری اور شوقِ شہادت کے باعث قربان ہونے کے لیے بیتاب تھے اور نگاہِ امامؑ دیکھ رہی تھی کہ آج عاشور کے دن جو شخص جتنی دیر میں شہید ہوگا اُس کی تکالیف میں اسی قدر اضافہ ہو جائے گا۔

شہید تو سب ہی کو ہونا ہے حتیٰ کہ علی اصغرؑ بھی نہ بچیں گے۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ کون پہلے شہید ہو، کون بعد میں شہید ہو۔ لہٰذا امامؑ نے اصحاب کو بنی ہاشم سے پہلے شہادت کی اجازت دے دی تاکہ اصحاب کی تکالیف بنی ہاشم سے کم رہیں اور سخت ترین امتحان کے لیے بنی ہاشم ہی کو منتخب کیا۔ اسی اصول پر بنی ہاشم میں اپنی اولاد کو اعزاء کے بعد شہادت کے لیے پیش کیا، تاکہ امتحان کی سختی اعزاء کے لیے اولاد سے کمتر رہے۔ میرے مولا! سب سے آخر میں علی اصغرؑ کو شہادت کے لیے پیش کرنا آپ کے کمالِ صبر کی نشانی اور مثال ہے۔

غرض کہ اصحاب کے بعد بنی ہاشم کو جب موقعِ شہادت ملا تو سب سے پہلے جناب مسلمؑ ابن عقیلؑ کے فرزند اپنے باپ کی پیروی و اتباع میں پہلے شہید ہونا چاہتے تھے کیونکہ راہِ کربلا کے شہیدِ اوّل جناب مسلم ہی ہیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن مسلمؑ جو اپنے چھوٹے بھائی سے

پہلے شہید ہونا چاہتے تھے اجازت لے کر میدانِ جنگ میں آئے حملہ پر حملہ کیا۔ بزدل دشمن عبداللہ کے نیزے کی تاب نہ لا سکے تو دور سے تیر بارانی شروع کر دی۔ پیاسے پر تیروں کی بارش اس قدر شدت سے کی گئی کہ عبداللہ نے ہر چند تیر کاٹنے شروع کیے تاہم اچانک ایک تیر آپ کی پیشانی کی طرف آرہا تھا جس کو آپ نے اپنے ہاتھ سے روکنا چاہا لیکن تیر نے ہاتھ کو پیشانی سے اس طرح چسپاں کر دیا جیسے کپڑا دھاگے سے سیا جاتا ہے۔ مسلمؑ کا پیاسا شیر پھر بھی ایک ہاتھ سے لڑتا رہا مگر جب ایک تیر کلیجے پر لگا تو عقیل کا پوتا گھوڑے سے زمین پر گرا اور مدد کے لیے اپنے امامؑ کو پکارا۔ امامؑ اپنے یتیم بھتیجے کی آواز پر شیرِ غضب ناک کی طرح بڑھے۔ مگر یہ وقت وہ تھا کہ بیٹا اپنے باپ کی خدمت میں حاضری کے لیے اپنے امامؑ پر سے اپنی جان فدا کر رہا تھا اور ممکن ہے باپ بھی کوفہ سے اپنے بیٹے کو لینے اور دادِ شجاعت دینے کے لیے کربلا آگیا ہو۔ یقیناً عبداللہ نے اپنے سرہانے مسلمؑ ابن عقیلؑ کو کھڑے ہوئے دیکھا ہوگا۔

الغرض حسینؑ سے جس قدر جلد ممکن ہو سکا عبداللہ ابن مسلمؑ کے سرہانے پہنچے۔ مگر اس دوران ایک قیامت خیز واقعہ یہ ہوا کہ جس ملعون کا تیر کلیجے پر لگا تھا اُس نے چاہا کہ اپنا تیر نکال لے۔ تیر نکلا مگر دل کو توڑ کے نکلا، پُشت کی جانب سے تیر کھینچا گیا۔ یہ ملعون خود کہتا تھا کہ اس کے بعد میں نے چاہا کہ پیشانی میں جو تیر پیوست تھا اُسے بھی نکال لوں۔ مگر میں نے دیکھا کہ عبداللہ دم توڑ رہے ہیں۔ ہائے افسوس! فرزندِ مسلمؑ کو جان دیتے وقت بھی سخت امتحان سے گزرنا پڑا کہ زخموں میں اضافہ ہو رہا تھا اور روح پرواز کر رہی تھی۔ پیشانی کے تیر اور روح میں کون پہلے نکلا اور کون بعد میں، یہ معلوم نہ ہو سکا۔ مگر حسینؑ جب پہونچے تو اسلام پر مسلمؑ کا فرزند قربان ہو چکا تھا۔ لاش کو میدان سے اٹھایا گیا۔ حسینؑ رو رہے ہیں۔ کبھی عبداللہ دیکھتے ہیں، کبھی عبداللہ کی خون میں ڈوبی ہوئی صورت میں اپنے سفیر، کوفہ کے شہید مسلمؑ

کی تصویر ڈھونڈتے ہیں۔ خیموں میں کہرام برپا ہے۔ عبداللہ اپنا حق ادا کر چکے۔

اب عبداللہ کا چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ عبداللہ
پر بہنے والے آنسو رُکے بھی نہیں تھے کہ رونے والوں نے عبداللہ کے چھوٹے بھائی کو بھی ر
رخصت کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں بھائی کی لاش بھائی کے برابر رکھی تھی۔ شہدا کے خون اور
میں بہنے والے آنسو شام تک اسی طرح گلے ملتے رہے اور گلے ملنے والے ایک ایک کر کے
گلا کٹاتے رہے اور بچھڑتے رہے۔

ساتویں مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ۙ﴿۱۶۹﴾

"اور جو لوگ راہِ خدا میں قتل ہوئے، تم اُن کو ہرگز مُردہ گمان نہ کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس (سے) رزق پاتے ہیں۔"

اللہ کی شدید تاکید ہے کہ شہیدانِ راہِ خدا کو ہرگز ہرگز مُردہ نہ خیال کرو۔ جو صاحبِ ایمان
ہادت کے اس راز کو جان لیتے ہیں اور شہادت کے بعد کی زندگیٔ جاوید کو پہچان لیتے ہیں
موت سے کتراتے نہیں، قتل سے گھبراتے نہیں بلکہ راہِ خدا میں جان کا نذرانہ پیش کرنے
لیے میدانِ جہاد میں شاداں اور فرحاں آتے ہیں۔ یوں عرض کروں کہ راہِ خدا میں مرنے
وں کے لیے میدانِ جنگ ایسا ہے جیسے عید گاہ۔ اور خون میں نہانا ایسا ہے جیسے غسلِ عید۔
زخمی ہو کر گرنا ایسا ہے جیسے نماز کا سجدہ۔ جو اس راز کو جانتے تھے انھیں خوشی تھی،
اتنی کہ اگر کوئی معانقہ کرنے کو نہ ملا تو دشمن کی تلوار سے گلے ملے۔ لچک دار نیزوں کو
سے لگایا۔ اُن کو نہ دیکھیے جو دولت کی لالچ میں لڑنے آتے ہیں۔ بلکہ اُنھیں دیکھیے جو
تِ ابدی لینے آتے ہیں، جیسے بدر میں مرنے والے، جیسے کربلا کے بہتّر شہید۔ یہ وہ شہیدِ راہِ خدا

تھے جو خود پائمالِ سمِ اسپاں ہو گئے۔ مگر اسلام و ایمان کی پائمالی گوارا نہ کی۔ اس میں شک نہیں کہ چاہے بدر کی لڑائی ہو یا خیبر کی جنگ، اُحد کی جنگ ہو یا جنگِ خندق، اِن تمام جنگوں میں اسلام اور کفر ہی کی لڑائی تھی، حق و باطل ہی کا مقابلہ تھا۔ انسانیت و حیوانیت برسرِ پیکار تھیں۔ لیکن آج دنیا کا ہر انصاف پسند آدمی یہ ماننے پر مجبور ہے کہ اسلام اور کفر کی جیسی لڑائی، حق و باطل کا جیسا معرکہ، انسانیت اور بہیمیت کی جیسی جنگ کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں ہوئی، ایسی نہ خندق میں ہوئی نہ خیبر اور اُحد میں۔ آج ہر صاحبِ نظر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ کربلا کے مقابلے میں اُحد کی لڑائی آسان تھی، خیبر کی جنگ سہل تھی، خندق کا معرکہ آسان تھا، اس لیے کہ ان تمام جنگوں میں اسلام کے مقابلہ میں کُفر، لباسِ کُفر ہی میں مدِ مقابل تھا، اور کربلا کے میدان میں کُفر، لباسِ کفر میں نہ تھا بلکہ کُفر کے چہرے پر اسلام کی نقاب تھی۔ جب کُفر نے اپنی چال بدلی تو وارثِ اسلام حسینؑ ابن علیؑ نے بھی اپنا طریقۂ جہاد بدلا، رسولؐ نے مجبوراً قتل کر کے فتح حاصل کی اور حسینؑ قتل ہو کے فتحیاب ہوئے۔ وہاں فتح کا راز قتل کرنے میں پوشیدہ تھا، یہاں کامیابی شہادت میں مضمر تھی۔

یہ کہنا تو آسان ہے کہ حسینؑ کامیاب ہوئے، فتحیاب ہوئے۔ مگر کہنے والے یہ بھی قید لگا دیتے ہیں کہ کل یزید جیتا تھا آج حسینؑ جیتے ہیں۔ مگر میرے بھائیو! مجھ سے سُنیے۔ آپ جسے حسینؑ اور یزید کی جنگ کا دن سمجھتے ہیں وہ حسینؑ اور یزید کی جنگ کا دن نہیں تھا، وہ حسینؑ کی فتح کا دن تھا، یزید کی شکست کا دن تھا۔ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عاشور کے دن یزید اور حسینؑ کی جنگ ہوئی جس میں عاشور کی شام کو جب حسینؑ کا سر کٹ گیا تو حسینؑ تھوڑی دیر کے لیے بظاہر ہار گئے اور جب یزید نے سر کاٹ لیا تو یزید تھوڑی دیر کے

لیے بظاہر جیتا۔ البتہ جب حسینؑ نے دلوں پر قبضہ حاصل کیا، سیدِ سجاد نے ضمیر زندہ کر دیے
تب حسینؑ جیتے اور یزید ہارا۔ مگر میرے بھائیو! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ صبح عاشور نام ہے
اس صبح کا، جب حسینؑ کی فتح مکمل ہو چکی تھی اور یزید کی شکست مکمل ہو چکی تھی۔ یہ میرے الفاظ
دلیل کے بغیر قابلِ قبول نہیں سمجھے جائیں گے، اس لیے میں اپنی دلیل کے ثبوت میں ایک پُرانا
واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔

جناب آدمؑ کے دو بیٹوں کا واقعہ۔ جناب ہابیل نے بھی اللہ کی بارگاہ میں قربانی
پیش کی اور قابیل نے بھی۔ دونوں میں مقابلہ ہوا، ہابیل کی قربانی قبول کی اللہ نے
اور قابیل کی قربانی رد کر دی گئی۔ ہابیل جیت گئے اور قابیل ہار گیا۔ اس کے بعد قابیل
نے ہابیل سے کہا کہ اگر تم اس مقابلے میں جیت گئے ہو تو میں تم کو زندہ رہنے نہیں دوں گا۔
قابیل نے بڑھ کر تلوار چلائی اور ہابیل کا گلا کاٹ دیا۔ گلا تو ہابیل کا کٹا لیکن دنیا میں کوئی
آدمی یہ نہ کہے گا کہ گلا کٹنے سے قربانی کے مقابلے میں ہابیل کو جو کامیابی ہوئی تھی وہ شکست
سے بدل گئی اور جو ناکامیابی قابیل کو ہوئی تھی وہ فتح سے بدل گئی۔ نہیں بلکہ یہی کہے گا
کہ کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ دونوں میں مقابلہ کس بات پر ہوا تھا، مقابلے
میں قربانی کس کی قبول ہوئی؟ جب قربانی قابیل کی قبول نہ ہوئی تو وہ ہارا، اور ہابیل
کی قبول ہوئی تو وہ جیتے۔

اب اگر قابیل قتل کر رہا ہے تو فاتح کو مٹا کر فتح کا نشان مٹا رہا ہے۔ اسی طرح
دیکھئے، حسینؑ اور یزید میں کشمکش کہاں سے شروع ہوئی؟ کربلا کے میدان میں نہیں شروع ہوئی
بلکہ جب مدینہ میں یزید کے گورنر ولید نے حسینؑ سے یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا تھا۔ حسینؑ نے
کہا میں بیعت نہیں کروں گا۔ معلوم ہوا جیسے ہابیل اور قابیل کے درمیان معرکہ اس بات پر تھا

کہ دیکھیں قربانی کس کی قبول ہوتی ہے؟ اسی طرح حسینؑ اور یزید کے درمیان معر
اس بات پر تھا کہ وہ کہتا تھا، میں بیعت لوں گا۔ حسینؑ کہتے تھے میں بیعت نہ کروں گا
جس طرح قابیل قربانی کے مقابلے میں ہار گیا اور ہابیل کی قربانی قبول ہوئی تو وہ جیت
گئے اسی طرح حسینؑ جیتے کہ اُن سے بیعت نہ لی جاسکی اور یزید کو شکست ہوئی کیونکہ و
بیعت نہ لے سکا۔ اُس نے مدینہ میں بڑی تدبیریں کیں مگر حسینؑ نے مدینہ چھوڑ دیا۔ مکہ
میں کوشش کی، حسینؑ نے مکہ چھوڑ دیا، کربلا میں راستہ روک لیا گیا۔ حسینؑ نے کہا میں
ٹھہر جاؤں گا مگر بیعت نہ کروں گا۔ فرات کے کنارے سے خیمے ہٹائے گئے، حسینؑ
نے کہا جلتی ریت پر خیمے لگا لوں گا۔ مگر بیعت نہ کروں گا۔

نویں محرّم کی شام کو لشکرِ یزید نے حملہ کرنے کا ارادہ کر کے کہا کہ بیعت کرو ور نہ
جنگ ہو گی۔ حسینؑ نے رات بھر کے لیے جنگ ملتوی کرائی کہ میں عبادت کرلوں، مگر بیعت
نہ کروں گا۔ عاشور کی صبح کو پسرِ سعد نے پہلا تیر پھینکا، کہ حسینؑ موقع ہے اب بھی بیعت
کرلو۔ حسینؑ نے کہا مسلم ابن عوسجہ اور سعید کو تیروں سے چھلنی ہونے کے لیے پیش کردوں گا
مگر بیعت نہ کروں گا۔

معلوم ہوا چھ مہینے سے یزید مدینہ میں، مکہ میں، کوفہ کے راستے میں، حُر کے لشکر کے
ذریعے، ابنِ زیاد اور پسرِ سعد کی سپاہ کے ذریعے، غرض کہ ہر تکلیف و مصیبت کے
ذریعے حسینؑ سے بیعت لینے کی کوششیں کرتا رہا، مگر حسینؑ نے کہا سب کچھ ممکن ہے لیکن
بیعت ممکن نہیں۔ جب صبح عاشورہ ہوئی تو حسینؑ مسکرا رہے تھے، یزید دیکھ تیری طاقتیں
ختم ہو گئیں مگر تو بیعت نہ لے سکا۔ یزید کا سر ندامت سے جُھکا ہوا تھا حسینؑ سچ کہتے
ہو، طاقت آزمائی بھی کی لیکن میں تم سے بیعت نہ لے سکا۔ صبح عاشور فتح حسینؑ کی صبح اور

شکستِ یزید کی صبح تھی۔ البتہ جیسے قربانی کے مقابلے میں ہار کے قابیل نے تلوار کھینچ کر جیتنے والے ہابیل کی گردن کاٹی تھی اسی طرح ہارا ہوا یزید اب تلوار سے فاتح کا گلا کاٹنا چاہتا ہے، اور اپنی جھوٹی فتح اور ندامت کا نقّارہ بجا کر مشتہر کرنا چاہتا ہے کہ میں نے حسین پر فتح حاصل کرلی۔ لیکن اس گُم کردہ راہ کو یہ کب معلوم تھا کہ یہ تو حسینؑ کی فتح ہے جس کی وجہ سے قیامت تک حسینؑ کی فتح کا نقّارہ چہار دانگِ عالم میں بجتا رہے گا اور اسلام کا پرچم بلند و بالا رہے گا۔ اُس نے یہی سوچا تھا جو قابیل نے سوچا تھا کہ جب ہابیل نہ رہیں گے فاتح نہ رہے گا تو فتح بھی نہ رہے گی۔

اسی طرح یزید نے سوچا کہ حسینؑ نہ رہیں گے تو فتحِ حسین کا نقّارہ کون بجائے گا، یزید کو یہ خبر نہ تھی کہ زینب اور اہلِ بیتِ حسینؑ جن کو اُس نے شہر بہ شہر، بازاروں اور درباروں میں پھرایا تھا وہ حسینؑ کی فتح اور یزید کی شکست کی تبلیغ کر رہی تھیں۔ جدھر جدھر سے یہ لُٹا ہوا قافلہ گزُر رہا تھا اعلان کرتا جا رہا تھا کہ حسینؑ اپنا اور اعزا و انصار کا گلا کٹا سکتے ہیں، ہم ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہن کر شتران بے کجاوہ پر سر و پا برہنہ پھرائے جا سکتے ہیں بیعت کسی کی بھی نہیں کی جا سکتی۔

اس جگہ پر ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب صبحِ عاشور حسینؑ کی فتح مکمّل ہو چکی اور یزید کی شکست مکمّل ہو چکی تو شیعوں کو تو خوشی منانا چاہیے، غم کیوں مناتے ہیں۔؟

تو میں ان سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر قربانیٔ اسمٰعیل کی یاد بطور غم ہوتی تو قربانیٔ حسینؑ کی یاد بطور خوشی ہوتی۔ مگر وہ عید کا دن ہے، اس لیے کہ نبی زادہ بچ گیا ذبح نہیں ہوا۔ لہٰذا محرم میں ماتم کیجیے، غم منائیے کہ نبی زادہ مار ڈالا گیا۔ پیغمبر کا باغ تاراج ہو گیا جن لوگوں کو محبت ہے

حسینؑ سے، وہ فاقہ کرتے ہیں، اور کیسے فاقہ نہ کریں جب کربلا میں سب فاقہ سے تھے۔ میدانِ کربلا میں سب بھوکے پیاسے تھے لیکن روزہ کسی نے نہیں رکھا تھا صرف اسی لیے محبِّ حسینؑ بھی روزہ نہیں رکھتے فاقہ کرتے ہیں حسینِ مظلوم کی تاسّی میں۔ اس کے برخلاف جو یزید کی پیروی کرتے ہیں وہ روزِ عاشور بطور مسرّت روزے رکھتے ہیں۔

میدانِ کربلا میں علی اکبرؑ مصروفِ جہاد ہیں کہ پیاس نے شدّت اختیار کی، پلٹ کر بابا کے پاس آئے، بابا سے پانی مانگا، مگر حسینؑ مجبور ہیں۔ آہ آہ، آج حسینؑ کے اُس کڑیل جوان کا ماتم ہے جو صورت میں، سیرت میں، رفتار و گفتار میں پیغمبر سے مشابہ تھا جس کا نام علیؑ تھا اور یہ حسینؑ کی محبّت تھی اپنے بابا اور اپنی مادرِ گرامی سے کہ اپنی دونوں بیٹیوں کا نام فاطمہؑ رکھا اور تین بیٹے تھے تینوں کا نام علیؑ رکھا۔ تو پہچانے کیسے جائیں۔ ایک کربلا میں زندہ بچے جو علی ابن الحسینؑ زین العابدین کے نام سے مشہور ہوئے، کربلا میں دو بیٹے شہید ہوئے علی اکبرؑ اور علی اصغرؑ۔

پانچ منٹ مصائب پڑھوں گا مگر دوستدارانِ حسینؑ، حسینؑ کے کڑیل جوان کا ماتم اس طرح کریں کہ خود حسینؑ بھی دعا کے لیے ہاتھ بلند کریں اور انھیں کی دعاؤں سے ہم زندہ ہیں، انھیں کے غم سے ہماری زندگی ہے۔ جب جناب عباسؑ بھی نہ رہے تو یزیدی فوج نے حسینؑ سے کہا کہ حسینؑ تم خود آؤ یا کسی اور کو بھیجو، تو علی اکبرؑ چلے۔ علی اکبرؑ چلے تو بیبیوں نے روکا، بہنوں نے روکا، پھوپھی نے روکا، سب سے رخصت ہو کے چلے، تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ ایک مرتبہ اکبرؑ نے آہٹ محسوس کی، جیسے کوئی ان کے پیچھے دوڑتا ہوا آرہا ہو، اور پھر اچانک گرنے کی آواز محسوس ہوئی۔ اکبرؑ نے مُڑ کے دیکھا تو بوڑھا باپ جس کی کمر غمِ عباس سے ٹوٹ چکی تھی اور اب علی اکبرؑ نوجوان بیٹا رخصت کے وقت باپ کی بصارت بھی لے جا رہا تھا۔ علی اکبرؑ نے گھوڑا موڑ کر باپ سے عرض کی، بابا! بس اب آپ کو دادی جان کی قسم پلٹ جائیے۔ حسینؑ نے فرمایا بیٹا!

اگر تم صاحبِ اولاد ہوتے تو اس محبّت کی حقیقت کا پتہ چلتا، کہ باپ کا دل اولاد کے لیے کتنا بے چین ہوتا ہے۔ اے لال! بس اتنا کرنا جب تک میرا سامنا رہے، مُڑ مُڑ کر میری طرف دیکھتے رہنا۔

علی اکبرؑ گئے، جنگ کی، زخمی ہوئے۔ مرے دوستو! حسینؑ مظلوم کے شیعو! سُن لو، پھر بھلا وہ کون انسان ہے جو سینے میں انسان کا دل رکھتے ہوئے نہیں روتا۔ اکبرؑ کربلا کے میدان میں آئے، ایک مرتبہ تلوار اور نیزہ سنبھال کر آواز دی، میں ہوں فرزندِ حسینؑ۔ کون ہے پسرِ سعد کے فوجیوں میں جو یہ کہتا ہے کہ حسینؑ کا سر کاٹ لوں گا۔؟ پہلے فرزندِ حسینؑ کا سر کاٹ لو، تب میرے باپ کے سر کی تمنّا کرنا۔ آستین پلٹ کر علی اکبرؑ نے جو تلوار سنبھالی تو لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ سر اتنے کٹے تھے کہ راستہ نہیں ملتا تھا، خون اتنا بہہ رہا تھا کہ گھوڑے کے قدم خون آلودہ تھے، ہر طرف سے الامان الامان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک مرتبہ پسرِ سعد گھبرا گیا اور شمر کو بُلایا اور مشورہ کیا کہ اکبرؑ سے کس طرح جنگ کی جائے؟ یہ بھی حسینؑ کا بیٹا ہے عباسؑ کا بھتیجا ہے۔ شیر کا بھتیجا بھی شیر ہی ہوتا ہے۔ پھر کہا کہ عباسؑ کے جب تک ہم نے شانے نہیں کاٹ لیے تب تک ہمارے قابو میں نہیں آئے، علی اکبرؑ بھی قابو میں نہیں آئیں گے جب تک دھوکے سے حملہ نہ کیا جائے۔

منصوبہ بنا کر فوج کا ایک دستہ للکار کے اکبرؑ کی طرف بڑھا، اور علی اکبرؑ نے جیسے ہی حملہ کیا کمین گاہ سے چھپ کے نیزہ برداروں نے حملہ کر دیا اور ایک نیزہ علی اکبرؑ کے سینے میں بڑا کاری لگا کہ ہڈیوں تک اور پھر کلیجے میں در آیا۔

ارے میں کہاں سے الفاظ لاؤں جو یہ بتاؤں کہ زخم کیسا گہرا تھا کہ قاتل نے جب نیزہ نکالنا چاہا تو نیزہ ٹوٹ گیا، اور سینے سے خون کا فوّارہ اُبلا، گھوڑے سے گرتے ہوئے بابا کو

آواز دی۔ بابا علی اکبرؑ کا آخری سلام قبول ہو۔حسینؑ کے کان میں اکبرؑ کی آواز پہونچی۔

ہاں میری بہنو اور بھائیو! سنو، اور حقِ ماتم ادا کرو۔ اکبرؑ کی آواز سُن کر حسینؑ چلے، حسین کیسے چلے راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ جب گرتے تھے تو پُکارتے تھے یا علیؑ، یا علیؑ۔ نجف کے علیؑ کو پُکارتے تھے مدد کے لیے اور بیٹے کو پکارتے تھے کہ کہاں ہو؟ اکبرؑ آواز دیتے بابا ادھر ہوں، بابا ادھر ہوں! حسینؑ اکبرؑ کی آواز سُنتے سُنتے اکبرؑ کے پاس پہونچے اور بوڑھے باپ نے کیا منظر دیکھا، پہلے زمینِ کربلا پر علی اکبرؑ کا خون دیکھا جہاں بیٹا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ پھر خون میں بھرا ہوا کُرتہ دیکھا، زخمی کلیجہ دیکھا، نیزے کا پھل دیکھا، تو بوڑھا باپ زمینِ کربلا پر بیٹھ گیا۔ کہا بیٹا کیا حال ہے؟ کہا بابا نیزہ کلیجے میں در آیا جس کی وجہ سے بے حد تکلیف ہے۔ دُنیا کا عظیم ترین انسان کربلا کے میدان میں عظیم امتحان دینے کے لیے بیٹھ گیا۔

حسینؑ جب علی اکبرؑ کے سینے کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھے تو جنّت میں قیامت ہوگئی، انبیاء کا مجمع کربلا کے میدان میں سمٹ آیا۔ رسولؐ نے اپنا روضہ چھوڑا، جنّت البقیع سے بنتِ رسولؐ آئیں، نجف سے علیؑ آئے اور حسینؑ کے بھائی حسنؑ نے اپنی قبرِ مطہّر چھوڑی، ملائکہ جمع تھے، عالم میں سنّاٹا تھا، زمینِ کربلا کانپ رہی تھی اور اللہ کا بندہ حسینؑ ایک عظیم امتحان دینے کے لیے بیٹھا تھا۔

آگے کیسے بتاؤں۔ میرا تصوّر کہتا ہے کہ چاروں طرف ملائکہ، ان کے درمیان انبیاء حسینؑ کے گرد رسولؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسن اور علی اکبرؑ کے زخمی سینے کے پاس حسینؑ۔ ماں نے کہا ہوگا، بیٹا دل سنبھالو، میرے دودھ کی تاثیر دکھا دو بیٹا! حسنؑ نے آواز دی ہوگی بھائی گھبرانا نہیں۔ نانا نے کہا ہوگا حسینؑ! میری زبان کا اثر دکھا دینا، علیؑ نے کہا ہوگا، بیٹا! تم

فاتحِ خیبر کے جگر ہو۔ بس ایک مرتبہ حسینؑ نے آستین اُلٹی، اکبرؑ کے زخمِ جگر پر ہاتھ رکھ کر
نیزے کا پھل پکڑا اور "یا علیؑ مدد دے" کہہ کر جو نیزے کا پھل کلیجے سے نکالا تو کلیجہ بھی ساتھ
ہی نکل آیا، خون اُبلنے لگا، اکبرؑ سے حسینؑ لپٹ گئے، "بیٹا اکبرؑ، بیٹا اکبرؑ" کہہ رہے تھے، ک
علی اکبرؑ نے کہا بابا خدا حافظ، دادا جان جامِ کوثر لے کر آگئے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

آٹھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابُ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَاِنَّھُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَ عَلَیَّ الْحَوْضَ۔

"پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشاد ہے کہ میں تم میں دو گرانقدر اور باعظمت چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب ہے اور دوسری میری عترت جو میرے اہلبیتؑ ہیں۔ تم جب تک ان دونوں سے تمسّک رکھو گے ہر گز گمراہ نہ ہو گے یہاں تک یہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر پہونچیں۔"

پیغمبرؐ کی اس حدیث سے چند باتیں اس قدر واضح ہیں جن کا سمجھنا آسان ہے اور جن کا انکار کسی بھی سچّے مسلمان کے لیے بے حد دشوار ہے۔ البتہ جس شخص نے نہ سمجھنا ہی طے کر لیا ہے اُسے کوئی سمجھا نہیں سکتا اور جس نے نہ ماننے کی نیّت کر لی ہے اُسے کوئی ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

اللہ نے بھی محشر کے دن کو منوانے کا دن مقرّر کیا ہے۔ اس سے قبل مانو یا نہ مانو کا اختیار دے دیا ہے۔ مگر انسان کو بھولنا نہیں چاہیے کہ وہ آزاد نہیں کر دیا گیا ہے بلکہ

وہ اپنے ارادے و اختیار سے نیک بنتا ہے یا بد۔ اس مقصد کے لیے انسان کو اُس کے اعمال و افعال کی حد تک آزادی دے دی گئی ہے لیکن کل ہر شخص کو جو آزادی دی گئی اُس کا حساب لیا جائے گا اور جنھوں نے آزادی پا کر بھی خدا کی بندگی نہ بھلائی اُن کو جنّت میں جگہ ملے گی، اور جنھوں نے آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اُن کو دوزخ کی جیل میں ہمیشہ رہنا ہوگا، جس دوزخ میں عذاب اور سخت عذاب کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔

غرض کہ میدانِ حشر میں حساب و کتاب سے پہلے جنّت یا دوزخ کا فیصلہ سُننے سے پہلے حوضِ کوثر ہی وہ جگہ ہے جہاں اُمّت کی ملاقات حضورؐ سے ہوگی۔ البتہ اس ملاقات کی شان یہ ہوگی کہ جن لوگوں نے حضورؐ کے دین کی پابندی کی ہوگی اُن کو حضورؐ کے پاس جگہ بھی ملے گی اور حوضِ کوثر کا جام بھی ملے گا، جس کے بعد کبھی نہ بھوک لگے گی نہ پیاس ستائے گی، اور جن لوگوں نے حضورؐ کا دین بدل ڈالا ہوگا، جنھوں نے اپنی خواہشِ نفس اور ہوس کے مطابق عمل کیا ہوگا اور حضورؐ کے دین کی مخالفت کی ہوگی اُن کو حوضِ کوثر سے پیاسا ہی اس طرح بھگا دیا جائے گا جس طرح اونٹ ہنکائے جاتے ہیں۔ پیغمبرؐ نے اپنی ایک حدیث میں بتایا ہے کہ کچھ لوگ جن کو دنیا کے لوگ نبیؐ کا مخصوص صحابی خیال کرتے ہوں گے مگر اُنھوں نے نبیؐ کے بعد دین میں تبدیلی کی ہوگی۔ ایسے اصحاب بھی حوضِ کوثر سے ہٹا دیے جائیں گے۔

غرض کہ حوضِ کوثر پر اُمّت کو نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔ ہم زندگی میں ہر بڑے سے ملاقات کی تیاری کرتے ہیں مگر دین و دنیا میں جو سب سے بڑے اور بزرگ ہیں جن سے خدا کے علاوہ کوئی بڑا نہیں ہے اُن سے کل ملاقات ہونا ہے، حوضِ کوثر کے کنارے ملاقات ہونا ہے۔ شدید پیاس کے عالم میں ملاقات ہونا ہے جب ہر شخص نہ صرف گھبرایا ہوا ہوگا بلکہ بوکھلایا ہوا ہوگا کہ والدین جو کسی حال میں بھی اولاد کو نہیں بھلاتے اُس دن وہ بھی اپنی پریشانی

اور بدحالی میں اس طرح گرفتار ہوں گے کہ اولاد کو بھی فراموش کر دیں گے۔ ایسی حالت میں ملاقات ہونا ہے اُس عظیم اور فیصلہ کُن ملاقات کے لیے تیاری کرنا ہر دیندار کا سب سے بڑا فرض ہے۔ اُس دن جب اُمّت نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوگی، تو نبیؐ صرف یہ دیکھیں گے کہ میں جس قرآن و اہلبیتؑ کو تمہارا محافظ بنا کر آیا تھا تم اُن کے ساتھ حوضِ کوثر پر میرے پاس آئے ہو یا اُن کو چھوڑ آئے ہو؟۔ جو اُن کو چھوڑ آیا ہے نبیؐ اُس کو میدانِ محشر میں اُس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور جس کو نبیؐ اُس کے حال پر چھوڑ دیں گے اُس کا حال سب سے زیادہ خراب ہوگا، اُس کا کوئی بھی پُرسانِ حال نہ ہوگا صرف دوزخ اور عذاب کے فرشتے اس کی خبر گیری کریں گے۔

البتہ جو حضرات قرآن و اہلبیت علیہم السّلام کے ساتھ خدمتِ نبیؐ میں حاضر ہوں گے اُن کو نبیؐ اپنے پاس جگہ دیں گے، حوضِ کوثر سے علیؑ اُن کو سیراب کریں گے، قرآن مجید اُن کی سفارش کرے گا۔ نبیؐ اور اہلبیتؑ اُن کی شفاعت کریں گے، خدا اُن پر رحم کرے گا۔ اگر اُن آنے والوں نے خود بھی نیک اعمال اور احکامِ دین پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کی ہوگی تو اُن کی شفاعت آسانی سے ہو جائے گی۔ البتہ جن لوگوں نے دین کی مخالفت نہیں کی مگر دین کی پابندی سے غافل رہے، سفرِ آخرت کے لیے سامانِ سفر جمع کرنے کی بالکل فکر نہ کی اُن کی شفاعت میں دیر لگے گی اور ان میں سے بعض ایسے گناہ گار ہوں گے جن کو کچھ دن کی سزا جھیلنے کے بعد شفاعت کے ذریعہ نجات ملے گی۔ ان کچھ دنوں کو معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ آخرت کا ایک دن دنیا کے پچاس ہزار دنوں کے برابر ہو سکتا ہے اور دوزخ کے عذاب کی ایک آنچ بھی دنیا کی پوری آگ سے کہیں زیادہ سخت ہوگی۔ دنیا میں پوری عمر بھی اگر خدانخواستہ کوئی آگ میں جلتا رہے تب بھی اس کی تکلیف دوزخ کی ایک لمحے کی تکلیف

سے کم اور بہت کم ہو گی۔ دوزخ کی ایک جھلک دیکھنے اور دوزخ میں ایک لمحہ رہنے کا تصوّر بھی دل و دماغ کو دہلا دینے والا ہے۔

لہٰذا ہم کو ہر وقت اپنے کریم و رحیم و مہربان خدا سے دعائیں مانگتے رہنا چاہیئے کہ ہم قرآن اور اہلبیتؑ سے وابستہ رہیں تا کہ دوزخ کے سخت عذاب سے نجات حاصل ہو، اور نعماتِ جنّت سے مستفیض ہو سکیں۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں کہ کوئی عمل خلافِ قرآن مجید اور اہلبیتؑ کی مخالفت میں نہ ہونے پائے۔

قرآن مجید اور اہلبیتؑ دونوں نے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور خمس کو ہم پر واجب بتایا ہے اور بے نمازی، بے روزہ، حج نہ کرنے والے، زکوٰۃ اور خمس کے نہ نکالنے والے کے لیے سخت عذاب کی خبر دی ہے۔

حلال روزی کمانا، حلال کھانا واجب بتایا ہے اور حرام کام سے روزی حاصل کرنا اور نجس و حرام غذا کو حرام بتایا ہے۔ ماں، باپ کی خدمت واجب بتائی ہے اُن کے دل کو ٹھیس پہونچانا سخت گناہ ہے۔ عزیزوں سے محبّت پڑوسیوں کی دیکھ بھال، ہر مومن کا احترام کرنا واجب بتایا ہے۔ عزیزوں کو چھوڑ دینا، پڑوسیوں کی خبر گیری سے غافل رہنا، مومن کی توہین کرنا حرام بتایا ہے۔ قرآن مجید نے اہل بیتؑ کی محبّت کو واجب بتایا ہے اور اہلبیت علیہم السلام نے احکامِ قرآن مجید پر عمل کرنا واجب بتایا ہے۔ قرآن مجید اور اہلبیت علیہم السلام سے دابستہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ انھوں نے جن باتوں کا حکم دیا ہے اُن پر عمل کیا جائے تا کہ ہم گمراہی سے محفوظ رہیں۔

یہ سوچنا کہ صرف قرآن پر عمل کریں یا صرف اہلبیتؑ کو مان لیں، دھوکہ اور گمراہی ہے، کیونکہ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق قرآن و اہلبیتؑ ایک دوسرے سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے،

ملیں گے تو دونوں ملیں گے، چھوٹیں گے تو دونوں چھوٹیں گے۔ ایک کا ملنا اور دوسرے
کا چھوٹنا ممکن نہیں ہے۔ ان میں تو موت کے بعد بھی جُدائی نہیں ہوتی۔

نوکِ نیزہ پر امامؑ مظلوم نے تلاوت کرکے دنیا کو بتلایا کہ سر و گردن میں جُدائی ممکن
ہے۔ لیکن ہم میں اور قرآن میں جُدائی ناممکن ہے۔ جب یزید اپنے ظلم و جور، زر و جواہر،
تخت و حکومت اور قوت و طاقت کے ذریعے اسلام اور قرآن اور اہلبیتؑ کے مٹانے
پر کمربستہ ہوکر آمادۂ نبرد ہوا تو دونوں نے اپنے محافظ اور ساتھی کو مدد کے لیے پکارا
حسینؑ نے ان کی صدا پر لبیک کہی اور شہدا کا مجمع اور اسیروں کا قافلہ لے کر نکلے۔ یہ سفر
مدینہ سے شروع ہوا اور دمشق میں ختم ہوا۔ شہیدوں کے سر دے کر اسلام کو سربلند کیا
اور اسیروں نے سروں کی چادریں دے کر قرآن کی حفاظت کی۔ دمشق جاکر یزید کو شکست
دی اور کربلا کی تعمیر کرکے منارۂ ہدایت روشن کیا۔ اس منارۂ ہدایت کو بلند کرنے میں
ہر شہید و اسیر نے حصہ لیا۔ لیکن جس طرح منارہ کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ بناوٹ میں
سب سے چھوٹا حصہ ہوتا ہے اسی طرح منارۂ ہدایتِ کربلا میں علی اصغرؑ شہدا میں اور
سکینہؑ اسیروں میں سب سے زیادہ کمسن لیکن سب سے زیادہ نمایاں قربانیاں ہیں۔

اسلام کو بیشک بھائی بہن نے مل کر بچایا، مگر ایک بھائی بہن تو حسینؑ اور زینبؑ
ہیں، اور ایک بھائی بہن علی اصغرؑ اور سکینہؑ ہیں۔ علی اصغرؑ باپ کے ہاتھوں دفن ہوئے
سکینہ بھائی کے ہاتھوں دفن ہوئیں، علی اصغرؑ اپنے خون بھرے کرتے میں دفن ہوئے اور
سکینہؑ اسی لباس میں دفن ہوئیں جس میں انتقال ہوا۔ علی اصغرؑ باپ کے ہاتھوں پر تیر
کھا کر مسکرائے اور دنیا سے گزر گئے، سکینہؑ باپ کا سر اپنی گود میں لے کر اتنا روئیں
کہ قید خانے ہی میں انتقال کر گئیں۔ رباب، اُجڑی گود والی رباب دمشق سے مدینہ

واپس آگئیں۔ مگر اصغرؑ اور سکینہؑ کو کھو کر واپس آنے والی کی دونوں آنکھوں سے ہمیشہ آنسو جاری رہے۔ دنیا یہی سمجھی کہ ماں اپنے نورِ دیدہ و نورِ نظر کا ماتم کرتی ہے مگر دھوپ میں بیٹھ کر ساری زندگی رونے والی رباب نے ہمیشہ سائے میں بیٹھ کر رونے کی استدعا کرنے والی عورتوں سے یہی کہا کہ مجھ سے سایے میں بیٹھنے کو نہ کہو میں نے اپنے امامؑ کی لاش کو دھوپ میں زمینِ کربلا پر دیکھا ہے۔

معلوم ہوا، رباب کا ماتم بیٹے کے لیے نہ تھا، بیٹی کے لیے نہ تھا، شوہر کے لیے نہ تھا بلکہ امامؑ کے لیے تھا۔ اُس امام کے لیے تھا جس نے اسلام و قرآن کی حفاظت کے لیے سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

آج ہمارے پاس اگر قرآن و اسلام ہے تو یہ نتیجہ ہے کربلا والوں کی قربانیوں کا۔ آج اگر ہم روتے ہیں تو اپنے محسنوں کو یاد کرتے ہیں جن کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔

آؤ آج اُس محسن کو یاد کریں جس نے گلے پر تیر کھایا جو باپ کی گود میں شہید ہوا جس کا چچا محسن ماں کی گود میں آنے سے پہلے ہی شہید ہوا۔ جس نے پیاس کی شدّت اور کمزوری کے باعث جھولے میں آنکھیں بند کر لیں، جس نے جان پر کھیل کر ناتوانی میں گردن اُٹھا کر شام کے لشکر کے سامنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر باپ کے بیان اور اپنی پیاس کی تصدیق کی تھی۔ جس کو پانی نہ دینے والے بھی چیخ مار کر رو رہے تھے۔ جس کے گلے پر لگنے والا تیر گردن چھید کر باپ کے بازو میں پیوست ہو گیا، جس کے گلے سے باپ نے تیر تو نکال لیا مگر دل سنبھالنا علی اصغرؑ کی لاش سنبھالنے سے زیادہ مشکل ہو گیا۔ جس کے خون کو امامؑ نے اپنے چہرے پر مَل لیا، جس کی لاش لے کر حسینؑ

بار بار خیمہ کے قریب جاتے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے، جس کو دیکھ کر ماں تصویرِ حیرت بنی کھڑی رہی، اور کہا تو اتنا کہا: "کیوں میرے لال، کیا تیرے جیسے کمسن بچّے بھی نحر کیے جاتے ہیں؟" جس کی ماں کو روتا چھوڑ کر امامؑ پُشت خیمہ پر آئے، تلوار سے قبر کھودی، اپنے چاند کو مٹّی کے سپرد کیا اور اس قدر گریہ فرمایا کہ قبر تر ہو گئی۔

نویں مجلس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ۔

(سورۂ آل عمران، آیت ۱۹)

"بے شک اللہ کے نزدیک دین فقط "اسلام" ہی ہے"۔

چاہیے تو یہ تھا کہ دنیا میں جس قدر بھی آدمی ہیں سب کا طور طریقہ، رہن سہن،
ول چال، رسم و رواج ایک ہوتا، اس لیے کہ سب ایک ماں باپ آدم و حوّا کی اولاد
یں۔ لیکن پوری دنیا بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ صورت تو ملتی جلتی ہے لیکن اور سب
چھ بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نہ بولی ایک، نہ رہنے سہنے کا طریقہ ایک، نہ رسم و رواج
یک۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی ربط نہیں۔ اس سے بڑھ کر
غیریت اور قطع تعلق کی کیا نوبت ہو سکتی ہے کہ سفید و سیاہ رنگ پر پست و بلند کا فیصلہ
ونے لگا، تمام انسانی برادری کو گروہوں میں بانٹ دیا گیا۔ یہ گروہ عالموں کا ہے،
گروہ حاکموں کا ہے، یہ جماعت کاروبار کرنے والوں کی ہے، یہ طبقہ نوکری کرنے کے
لیے پیدا ہوا ہے۔ علماء، حکّام اور تاجروں کی خدمت کرنا اس طبقے کا فرض ہے اور اس
دمت کا انعام یہ دیا گیا کہ نہ کسی کے ساتھ مل کر بیٹھ سکتے ہیں، نہ اُن سے کوئی رشتہ قائم

کرسکتا ہے۔ غرض کہ اللہ نے انسان کی ایک برادری بنائی تھی۔ لیکن خود غرض انسانوں نے برادری کو توڑ کر. برابری کے بجائے غیر. برابری کی ایک عمیق ترین خلیج پیدا کردی۔ ممکن ہے کوئی شخص یہ جواب دے کہ زبان اور رہن سہن کے انداز میں فرق اس لیے پایا جاتا ہے کہ ایک آبادی سے دوسری آبادی بہت دور اور اتنے فاصلے پر تھی کہ ایک سے دوسرے کی ملاقات ہونا دشوار ہی نہیں بلکہ محال تھی۔ اگر کوئی کبھی جان پر کھیل کر کسی مقام پر پہونچ بھی گیا تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور ایسا بھی ہوا ہے کہ اس آنے والے نے ان کو وحشی سمجھا اور وحشیوں نے نووارد کو آدم زاد کے بجائے دیوزاد سمجھا لہٰذا اسی دوری کی بنا پر آپس کے طور طریقے ایک نہ رہے۔ زبان بدلی، کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، رہنا سہنا سب کچھ بدل گیا۔

یہ وجہ اختلافِ معاشرت یا اختلافِ زبان کے لیے تو ایک حد تک درست کہی جا سکتی ہے۔ حالانکہ سب انسان پہلے ایک ہی جگہ پر آباد تھے۔ جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا، آدمی پھیل کر آباد ہونا شروع ہوئے اور آج ہفت اقلیم میں آباد ہیں۔ لہٰذا جب ایک ہی جگہ سے دوسرے مقامات پر منتقل ہوئے تو اپنے ساتھ اپنی زبان، اپنی معاشرت کے انداز بھی لے گئے۔ اس لیے سب کی زبان، سب کا رہن سہن ایک ہونا چاہیے۔ البتہ جب منتقل ہونے کے بعد باہمی رشتے ٹوٹ گئے، تو پھر جو جہاں بھی آباد ہوا اُس نے مقامی حالات کے مطابق بولی، رہن سہن میں تبدیلی کرلی اور رفتہ رفتہ ان تبدیلیوں نے ہزاروں زبانیں، سیکڑوں طرزِ معاشرت پیدا کردیے۔ خیر، ان چیزوں کے بدلے میں سب ہی حق بجانب تھے اور ہیں، کیونکہ جیسے جیسے ضرورتیں بدلتی ہیں، ضرورت کے مطابق چیزیں بھی بدلتی ہیں۔ لیکن ان چیزوں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسان نے ان چیزوں کو بدل دیا۔ جن کے بدلنے کا اُس کو کسی طرح حق نہیں تھا۔ چار برادریاں

بنا کر اونچ نیچ پیدا کر دی۔ سیاہ و سفید رنگ پر پستی و بلندی تقسیم ہو گئی۔ پوچھیے، اگر کوئی کالا
ہے تو کیچڑ یا کوئلے سے نہیں بنا ہے، یا آپ گورے ہیں تو کافور سے نہیں بنائے گئے، بلکہ
انسانوں کی خلقت مٹی سے ہے، رنگ سے کوئی فرق نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ رنگ تو اللہ کے
بنائے ہوئے ہیں آپ کون ہیں جو رنگ کی بنا پر انسانوں میں پست و بلند درجے قائم کریں۔ انسان
کو چار ٹکڑوں میں بانٹنے کا آخر ہم کو کیا اختیار ہے کہ ہم عالم تم حاکم، یہ محنت کش اور سب کا
خدمت گار۔ اسی ذات پات کے فرق نے انسان کو انسان سے علیحدہ کر دیا اور پستی و بلندی
نے ایک گروہ کو آقا اور دوسرے کو غلام بنا دیا۔

انسانوں کی تقسیم فطرت کے خلاف ہے، اور فطرت سے برگشتگی دراصل دین سے برگشتگی
ہے۔ اسلام وہ دین ہے جو فطرت کے خلاف کوئی حکم نہیں دیتا۔ اسلام اور دنیا کے اور مذاہب
فرق یہی ہے کہ دوسرے مذاہب میں خلاف عقل و فطرت حکم دیے گئے ہیں جو اس بات کی
نشان دہی کرتے ہیں کہ یہ مذاہب بعد کی پیداوار ہیں، انسان کی فطرت کے ساتھ دنیا میں
نہیں آئے اور اسلام کے علاوہ اور جس قدر مذاہب ہیں اُن کے ناموں ہی پر نظر کر کے دیکھ
لیجیے، سب میں جانب داری اور محدودیت کی بو آتی ہے ورنہ مذہب کو آفاقی ہونا چاہیے۔
دوسرے مذاہب یا تو اپنے پھیلانے والے کے نام سے موسوم ہیں یا جس جگہ سے وہ مذہب پھیلا
اُس کے نام پر مذہب کا نام رکھ دیا گیا۔ جیسے بودھ، عیسائی، پارسی، یہودی، قادیانی وغیرہ
وغیرہ۔ لیکن اسلام وہ نام ہے جس میں اس قسم کا کوئی شائبہ نہیں ہے، ایک عام دعوت ہے،
عام پیغام ہے، جس میں انسانوں کو انسانیت کے نام پر پکارا گیا ہے۔ اسلام کے معنی
کے سامنے سر جھکانے کے ہیں۔ جب سب ایک اللہ کے سامنے جھک جائیں گے تو سب کے
ایک ہی رُخ پر ہوں گے، تو آپس میں بے رُخی نہ ہو گی نہ کوئی اختلاف ہو گا، نہ رنگ و نسل میں

فرق کیا جائے گا نہ انسان، انسان کو ذلیل سمجھے گا، نہ فرقہ واریت کی بربریت ہوگی، نہ تعصّب کو خون کی ہولی کھیلنے کا موقع ملے گا۔ اسلام خالقِ عقل کا مذہب ہے۔ لہذا مذہب اور عقل میں اختلاف ممکن نہیں ہے۔ اور اگر کسی کی سمجھ میں اسلام اور عقل میں اختلاف نظر آتا ہے، تو یا اُس نے معلومات کی کمی اور تحقیق کے بجائے آبائی تقلید میں کسی ایسی چیز کو اسلام سمجھ لیا ہے جو اسلام نہیں ہے یا پھر اُس کی عقل اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے ورنہ مذہب خدا کی دَین اور عقل خدا کا عطیہ ہے۔

اسلام کی وہ خصوصیت جس پر وہ دوسرے تمام مذاہب کے مقابلہ میں ناز کر سکتا ہے وہ اُس کی مساوات ہے جہاں ہر مسلمان کو برابر کی عزّت حاصل ہے ایک فرش پر، ایک دستر خوان پر، ایک برتن میں سب کھانا کھائیں گے، سب ایک دوسرے سے شادی بیاہ کریں گے، سب ایک مسجد میں ایک ساتھ نماز ادا کریں گے۔ نہ صرف ہر مسلمان کو برابر کی عزّت دی گئی ہے بلکہ اگر کوئی کسی کو ذلیل نگاہ سے دیکھنا چاہے تو خدا ایسے شخص کو اس قہر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کی نگاہِ قہر کا تصوّر کرکے ہر مجرم کانپ جاتا ہے۔

اسلام میں صرف پرہیز گار یعنی پاکیزہ کردار کے مالک کو دوسرے پر اُس کے تقویٰ اور پرہیز گاری کے مطابق بلند رُتبہ قرار دیا گیا ہے۔ پاکیزہ کردار کے علاوہ نسل، رنگ، قبیلہ، خاندان، دولت، شہرت، حکومت، ساتھیوں کی تعداد وغیرہ کسی بنیاد پر کسی انسان کو دوسرے پر کوئی فوقیت و عزّت نہیں دی گئی ہے۔ اگر ایک کالا جس کے بزرگ کبھی غلام رہے تھے جو آج بھی غربت و عُسرت میں زندگی بسر کر رہا ہے، علم دین اور پرہیز گاری کا مالک ہو جائے تو نمازِ جماعت میں وہ پیش نماز ہوگا۔ گورے مشہور نسلوں کے افراد جو دولت وحکومت کے مالک ہوں بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہوں اُس کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

اسلام میں سب کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ اسی مساوات پر اسلام کو ناز ہے۔ یہی مساوات اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس دین میں فضیلت رتبہ، مرتبہ، عزت اور توقیر حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ دین دار بننا اور پرہیز گار ہونا اور جو لوگ ابتدا ہی میں بلند رُتبہ حاصل کرلیں اُن میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ کربلا میں اسلام کو زندہ کرنے کے لیے قربانیاں دی گئی تھیں۔ آج بھی گنجِ شہدا، جس میں حضرت امام حسین اور امام حسن علیہما السّلام جیسے معصوم اماموں کی گود کے پالے دفن ہیں۔ بنی ہاشم کے سادات دفن ہیں۔ اُسی ایک قبر میں حسینؑ کے تمام اصحاب واعزا، دفن ہیں جس میں غلام بھی ہیں اور آزاد بھی ہیں، حبشی بھی ہیں اور قریشی بھی ہیں۔ اسی گنجِ شہدا میں جناب قاسم بھی ہیں اور جناب جون غلام جناب ابو ذر غفاری بھی ہیں، جو غلام بھی تھے اور حبشی بھی، مگر تقویٰ و دین داری میں سادات و بنی ہاشم و اولادِ معصومین علیہم السّلام کے دوش بدوش و ہم قدم بھی تھے۔ قیامت تک گنجِ شہدا اسلامی مساوات کا زندہ ترجمان رہے گا۔ اس گنجِ شہدا سے الگ صرف چھ شہیدوں کی قبریں ہیں۔ جناب سید الشہدا کی قبر کے پائینِ پا جناب علی اکبرؑ کی قبر ہے اور جناب علی اکبرؑ سے متصل گنجِ شہدا ہے۔ جناب حبیبؑ کی قبر امامؑ کی قبر کے سامنے ہے۔

امام حسینؑ کے روضے سے الگ تین قبریں اور ہیں جو سب الگ الگ بنی ہیں۔ ایک جناب عباسؑ کی قبر، دوسرے جناب حُرؑ کی قبر، تیسرے جناب عون کی قبر۔ اس میں اختلاف ہے، کہ یہ عون بن علیؑ ہیں یا عون بن عبداللہ ہیں۔ ان چھ شہیدوں کے علاوہ سب کو امام زین العابدین علیہ السلام نے ایک ہی قبر میں دفن کیا جس کا نام آج بھی گنجِ شہدا ہے۔ لیکن آج میں آپ کو ایک ایسے گنجِ شہدا کا ذکر سُنانا چاہتا ہوں جس میں یہ چھ شہید بھی شامل ہیں جو دفنِ شہدا سے پہلے بنا جو چوتھے امامؑ کے ہاتھوں نہیں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں

بنا۔ آپ کو حیرت ہو گی یہ دوسرا گنجِ شہیداں کون سا ہے ؟ کہاں ہے ؟ کب بنا ؟ کس نے
بنایا ؟۔ آئیے آپ کو اس گنجِ شہیداں کی زیارت کراؤں، اس گنجِ شہیداں کا ذکر سناؤں
اُس کے بننے کا وقت بتلاؤں :

عاشور کا دن ہے، عصر کا وقت ہے، ۶۱ھ ہے، کربلا میں ابھی ابھی حسینؑ کا گلا
کاٹا گیا ہے۔ آفتاب کو گہن لگا ہے، آسمان خون کے آنسو رو رہا ہے، زمینِ کربلا کا کلیجہ
ہل رہا ہے، خیمے جل رہے ہیں، بیبیاں جسموں پر تازیانوں کے نشان لیے ہوئے خیموں سے
باہر نکل رہی ہیں، طمانچے کھائے ہوئے یتیم پناہ ڈھونڈ رہے ہیں مگر اُن کو کوئی پناہ دینے والا
نہیں ہے، بلکہ رونے پر طمانچے مارنے والے ہیں۔

غرض کہ عصرِ عاشور کربلا میں قیامت کا منظر ہے بلکہ قیامت پر قیامت آ رہی ہے
جلتی ریت پر زینبؑ بیبیوں اور بچّوں کو بٹھا رہی تھیں، پیاسوں کو پانی تو نہ پلا سکی
تھیں البتہ اُن کے آنسو پونچھنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ میدان سے خبر آئی کہ شہیدوں
کی لاشوں کو پائمالِ سمِ اسپاں کیا جا رہا ہے۔ ایک زینبؑ کسے کسے دیکھے، کس کس کو
تسلّی دے اور شہیدوں کی لاشوں کو پائمال ہونے سے کس طرح بچائے۔ زینبؑ فریاد
کرتی رہیں۔ پائمال شدہ لاشوں کو کن آنکھوں سے دیکھے۔ حسینؑ جن کو فاطمہؑ نے بڑی
مصیبتوں سے پالا تھا اُن کی لاش بھی پائمال ہو چکی تھی۔ مجبور زینبؑ نے شاید مدینہ
کو یاد کیا ہو، جہاں عبداللہ ابن جعفر، محمد ابن حنفیہ اور عبداللہ ابن عباس موجود تھے
مگر مجبور شاہزادی نے دل تھام لیا ہوگا۔ میدان سے خیمہ تک بھائی کی خبرِ شہادت
لانے والا کوئی نہ تھا۔ اگر ذوالجناح نے سنائی نہ سنائی ہوتی تو سکینہؑ کو یتیم ہونے کی
اطلاع دینے والا کوئی نہ تھا، تو مدینہ میں کون خبر لے جائے گا اور مدینہ سے کون مدد کر

آسکتا ہے۔ لیکن نہیں، ایسا نہیں ہوا کہ مدینہ کا باغ کربلا میں کاٹ ڈالا گیا اور مدینہ والوں کو خبر نہ ہوئی۔ مدینۃ النبیؐ کو نبیؐ ہی نے خبرِ شہادتِ حسینؑ پہونچائی۔ حضورؐ نے حدیث کے ذریعے بتا دیا تھا کہ جو شخص مجھے خواب میں دیکھے وہ اُسے خواب نہ سمجھے، بلکہ وہ میری زیارت کرتا ہے اور مجھ ہی سے بات کرتا ہے۔ چنانچہ ٹھیک جس وقت کربلا میں غیور زینبؑ اپنے مدینہ کے عزیزوں کو شاید یاد کر رہی ہوں گی، اُسی وقت جناب ابن عباسؓ اور جناب ام المومنین ام سلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خواب میں دیکھا اور ایسی حالت میں دیکھا کہ زندگی میں بھی اس حالت میں نہ دیکھا تھا کہ سر اور چہرے پر خاک ملے ہیں، گریبان چاک، ننگے سر اور برہنہ پا ہیں۔ حیران ہو کر پوچھا کہ:

حضورؐ! یہ آپ کا کیا حال ہے؟

فرمایا: میں کربلا سے آرہا ہوں۔ میرا حسینؑ بھوکا پیاسا ذبح کر دیا گیا۔ اُس کے سارے ساتھی اور اعزّا بے گور و کفن جلتی ریت پر پڑے ہیں۔ اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک شیشہ دکھایا جس میں تازہ خون تھا۔ اور فرمایا کہ میں نے اس شیشے میں حسینؑ اور ان کے ساتھ شہید ہونے والے ایک ایک شہید کا خون جمع کیا ہے۔

یہی وہ گنجِ شہیداں تھا جو رسولؐ کے ہاتھوں دفن شہداء سے پہلے بنا، جس میں ہر شہید کا خون شریک تھا۔ مساواتِ اسلامی کا یہ زندہ نمونہ تھا جسے حضورؐ نے پیش کیا۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ کی آنکھ کھُلی یاد آیا کہ نبی نے میرے پاس کربلا کی وہ مٹی رکھوائی تھی جو جبرئیلؑ نے لا کر دی تھی اور فرمایا تھا، جب یہ مٹی خون ہو جائے تو سمجھ لینا میرا لال

حسینؑ شہید ہو گیا۔

اُم سلمہ دوڑی ہوئی گئیں، مٹّی کو خون بن کر جوش مارتے دیکھا، کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں۔ ہائے حسینؑ! کہہ کر رونا شروع کر دیا، بنی ہاشم میں کہرام برپا ہو گیا۔ بیمار بیٹی اپنے باپ کو رو رہی تھی۔ سب اُس کو پُرسا دے رہے تھے اور کربلا میں سکینہؑ کو باپ کا پُرسا دینے کے بجائے رونے پر طمانچے مارے جا رہے تھے۔

مدینہ میں ایک ماں بھی تھیں۔ جن کے چار بیٹے کربلا میں شہید ہو گئے تھے۔ مگر وہ ماں عورتوں سے کہہ رہی تھیں، میرے عباسؑ کا پُرسا نہ دو، میں تو فاطمہؑ کی کنیز ہوں، میری گود کے پالے، میری شاہزادی کے فرزند پر صدقے ہو گئے۔ بیبیو! مجھے حسینؑ کا پُرسا دو۔ میری شہزادی کا گھر اُجڑ گیا۔

دسویں مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَالۡعَصۡرِ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ؏

(سورۂ والعصر پارہ ۔ ۳۰)

"عصر کی قسم، بے شک انسان خسارے ہی میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور اعمال صالح بجالائے اور حق کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

اس سورہ کے بہترین مصداق کربلا والے ہیں کہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ رضائے خدا اُن کے سروں پر سایہ فگن تھی، رحمتِ باری ان کو گھیرے ہوئے تھی۔ ان وفاداروں کے خون کا ہر قطرہ آج تک عالمِ انسانیت کی رہبری کر رہا ہے کل ان کے لہو کی دھاریں ظلم کی ہر بستی کو بہا دینے کے لیے تیار تھیں۔ صبح عاشور مظلومیت کا مختصر سا لشکر تمام دنیا کو فتح کر لینے پر آمادہ تھا۔ جب گرم زمین پر اجسامِ بے سر ظالم حکومت کے تخت کو تاراج کرنے پر آمادہ تھے۔ تب شہدا کی آخری فرد علیؑ کا لال خود رخصتِ آخر کے لیے خیمے میں آیا اور اپنی بہن زینبؑ کو بُلایا۔ زینبؑ سامنے آئیں۔ بھیّا! کیا چاہتے ہو؟

فرمایا، میرا پُرانا لباس لے آؤ۔ کہا کیوں بھیّا؟ فرمایا، اس لیے، کہ لباس کے نیچے پُرانے کپڑے
پہننا چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد لباس اُتارا جائے تو میّت برہنہ نہ رہنے پائے۔ کیسی تھی وہ
بہن جس نے پُرانے کپڑے بھائی کو لا کر دیے تا کہ مرنے کے بعد میّت برہنہ نہ رہنے پائے۔

میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ یہ کپڑے نہ تھے بلکہ زینبؑ حسینؑ کو اُن کی زندگی ہی میں کفن پہنا
رہی تھیں۔ جب میرا مولا لباس تبدیل کر چکا تو فرمایا، اے بیبیو اور بچّو! تم بھی اسیری کے
لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کے بعد اپنے بیمار بیٹے کے پاس تشریف لائے اور اسرارِ امامت تفویض
فرما کر سیّد سجادؑ سے رخصت ہوئے تو حسینؑ کے پیچھے پیچھے عورتیں اور بچّے بھی درِ خیمہ تک آئے۔
سارے خیموں سے گزر کر قنات کے پاس گھوڑا کھڑا ہوا تھا۔ حسینؑ نے رُک کر خیمے میں جتنے
بچّے اور عورتیں تھیں سب پر نظر ڈالی۔ حسینؑ کو خیال آیا میرے بعد ان سب پر کیا کیا مصائب
پڑیں گے۔ سکینہؑ پر نظر کی، خیال آیا کہ طمانچے کھائے گی۔ زینبؑ پر نظر پڑی تو خیال آیا، بازوؤں
میں رسن بندھے گی۔ رباب پر نظر پڑی، خیال آیا اس کی مشکیں کسی جائیں گی۔ بس جس پر نظر پڑی
اس کے قید ہونے کا منظر یاد آیا، اور جب منظر یاد آیا تو حسینؑ کا دل بے چین ہو گیا۔ لہٰذا
ایک ایک کو پکارا، اور ہر ایک کو تسلّی دی، اور پھر سب کو سلام کیا، یہاں تک کہ فضّہ اپنی
ماں کی کنیز کو بھی سلام کیا اور فرمایا، اے ماں کے زمانہ کی نشانی، کل جسے تم نے جھولا
جھلایا تھا آج وہ موت کے جھولے میں جا رہا ہے۔ عزادارو! اگر رخصت کر کے جسے
دیکھا اُسے بے چین پایا۔ سب سے زیادہ زینبؑ بے چین تھیں۔ حسینؑ نے دل میں سوچا
حسینؑ! تم تو مرنے جا رہے ہو، اور یہ پورا قافلہ زینبؑ کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہو۔
اے حسین! اگر زینبؑ اتنی ہی بے چین رہیں تو قافلے کو کون سنبھالے گا؟

حسینؑ اپنے دل سے کہہ رہے ہیں اے حسینؑ! مرنے کے لیے بعد میں جانا، پہلے زینبؑ

کا دل سنبھالو۔ یہ سوچ کر حسینؑ آگے بڑھے۔ اے زینبؑ میری بہن زینبؑ! تیرا بھائی مرنے جا رہا ہے۔ یہ کہنا تھا حسینؑ کا کہ زینبؑ کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ کہا، سنو زینبؑ سنو! بھائی کی بات سنو! تیرا بھائی مرنے جا رہا ہے۔ مگر اے زینبؑ! میں اُس وقت مرنے نہیں جاؤں گا جب تک تم خوشی سے نہ کہو گی کہ جاؤ حسینؑ۔ زینبؑ نے ہاتھ جوڑے، بھیّا! کسی بہن نے اپنے بھائی کو خوشی سے مرنے کے لیے رخصت کیا ہے۔ کہا نہیں زینب، اگر تم مجھے رو کر رخصت کرو گی تو میں جب قاتل کے خنجر کے نیچے تمھارا چہرہ یاد کروں گا تو بے چین ہو جاؤں گا، اور اگر تم مُسکرا کر رخصت کرو گی تو میں مُسکرا کر گلا کٹا دوں گا۔ زینبؑ کیا چاہتی ہو؟ تیرا بھائی تڑپے یا مُسکرائے؟۔ بس زینب نے آنسو پونچھے، خیمے کا پردہ اٹھایا، بھیّا جاؤ۔ قنات کے پاس حسینؑ کا گھوڑا کھڑا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہونے کے بجائے میرا مولا دائیں اور بائیں دیکھنے لگا۔ زینبؑ نے کہا، بھیّا، وہ عباسؑ و اکبرؑ کہاں رہے جو رکاب تھام کر سوار کرتے تھے۔ میرے بھیّا، جو جانیں دے چکے انھیں اب نہ یاد کرو۔ کہا زینبؑ! جب میں سوار ہوتا تھا تو عباسؑ رکاب پکڑتے تھے، قاسمؑ گھوڑے کی لگام پکڑتے تھے، اکبرؑ بازو پکڑتے تھے۔ اے زینب! اب کوئی نہ رہا۔ زینب بولیں، بھیّا، آؤ میں سوار کروں گی زینبؑ نے ایک ہاتھ سے رکاب تھامی دوسرے ہاتھ سے حسینؑ کا بازو پکڑا، حسینؑ کو سوار کیا۔ حسینؑ نے چاہا کہ گھوڑے کو آگے بڑھائیں، مگر خیال آیا، میرے پیاسے گھوڑے میں نے بڑی تکلیف دی، مگر آج کے بعد تکلیف نہ دوں گا۔ یہ میرا آخری سفر ہے۔ اے میرے وفادار گھوڑے، قدم اُٹھا۔ یہ کہہ کر حسینؑ نے لگام کو جُنبش دی تا کہ گھوڑا قدم اُٹھائے۔ گھوڑے نے قدم نہ اُٹھایا۔ قدم اُٹھانے کے بجائے ایک مرتبہ سر اُٹھا کے حسینؑ کو دیکھا اور سر جھکا کر اپنے پیروں کی طرف اشارہ کیا۔ امامؑ نے جُھک کے دیکھا کہ سکینہؑ گھوڑے کے پیروں سے لپٹی ہوئی

کہہ رہی ہے۔ ارے میرے بابا کو نہ لے جا۔ میں یتیم ہو جاؤں گی۔ حسینؑ اُتر پڑے، بچیؑ کو کلیجے سے لگا کے پیار کیا جس حسینؑ نے مدینے سے چلتے ہوئے اصغرؑ کے کان میں کچھ کہا تھا اور اصغرؑ بہن کی گود سے باپ کی آغوش میں چلے آئے تھے۔ اسی حسینؑ نے سکینہؑ کے کان میں کچھ کہا، جس کے سُنتے ہی سکینہؑ نے کہا، اچھا بابا تم اسلام پر مرنے جا رہے ہو تو جاؤ مگر آخری بار مجھے سینے سے لگا لو، اور بابا آپ کی موت کے بعد میں یتیم ہو جاؤں گی تو پھر میرے سر پر کوئی ہاتھ نہ رکھے گا۔ بابا، آپ میرے سر پر اس طرح ہاتھ رکھ دیجیے جیسے یتیم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

حسین نے پیار کیا، سکینہ کے سر پر ہاتھ رکھا، گھوڑے پر سوار ہوئے، اب جو چلے تو سکینہ کہہ رہی تھیں، بابا خدا حافظ !۔ ادھر حسینؑ کربلا میں دشمنوں میں گھر کر گھوڑے سے گر چکے ہیں۔ بیبیوں کو خبر نہیں ہے کہ کیا ہوا کہ زمینِ کربلا میں زلزلے کے جھٹکے آنے لگے۔ زینبؑ نے دوڑ کر سیّدِ سجاد کا بازو ہلایا۔ کہا، بیٹا، دیکھو دنیا میں کیا ہو گیا۔ کہا پھوپھی امّاں خیمے کا پردہ ہٹائیے۔ پردہ ہٹایا۔ سیّدِ سجادؑ نے دیکھا نیزۂ طویل پر بابا کا سر ہے، آپ نے کہا، السلام علیك یا ابا عبد اللّٰہ !، السلام علیك یابن رسول اللّٰہ ! پھوپھی امّاں بابا شہید کر دیے گئے، ہم لاوارث ہو گئے۔ ادھر امام شہید ہوئے اُدھر عمر سعدؔ نے حکم دیا کہ لاش پر گھوڑے دوڑائے جائیں۔ حکم کی دیر تھی میدان میں لاشوں پر گھوڑے دوڑائے جانے لگے۔ جب یہ مصیبت بھی ختم ہو چکی تو اب لشکر نے خیموں کا رُخ کیا، اسباب لوٹا گیا۔

اے پردہ دار بیبیو! اے زینب کو پُرسا دینے والی بیبیو! دل تھام کر سنو! تمھاری شہزادیوں کے زیور چھن گئے، سب اسباب لُٹ گیا، مگر شہزادیاں سہمی ہوئی دیکھ رہی تھیں۔

لن جب سروں سے چادریں چھینی جانے لگیں تو ہر بی بی اپنی چادر سے لپٹ جاتی تھی۔ جب
دریں بھی نہ رہیں تو ہر ایک بی بی دوسری کے پیچھے چھپ کر پردہ باقی رکھنے کی کوشش
ر رہی تھی۔ اس عالم میں لرزتا ہوا آفتاب گوشۂ مغرب میں جا چھپا۔ مقتل میں شام ہوئی،
ی ہے شامِ غریباں۔

جب شامِ غریباں کی سیاہی پھیلی تو چاند اور ستاروں کے سوا کوئی بیکسوں کو روشنی
ہونچانے والا نہ تھا۔

سُنو سُنو! حسینؑ کی لاش کے سرھانے شمع نہ تھی، بہن کے گھر میں چراغ نہ تھا،
راغ کیسا، گھر ہی نہ تھا۔ ایک ایک خیمہ جل چکا تھا۔ حسینؑ کے واسطے کفن نہ تھا۔ بہن کے
سر پر چادر نہ تھی، حسینؑ کا جسم زخموں سے چوُر تھا۔ بہن کا جسم بھی تازیانوں سے نیلا تھا۔ اُدھر
بھی بے کسی رو رہی تھی، یہاں بھی حسرت و یاس کا سامنا تھا۔ بس یہی عالم تھا جس طرح
پ اس مجلس میں بیٹھے ہیں۔ نہ فرش تھا، نہ روشنی تھی، نہ سایہ تھا، نہ کوئی محافظ، سب کے
ب سر و پا برہنہ تھے۔

مگر عزادارانِ حسین! تھوڑی دیر پہلے جو بچے کبھی باپ سے پانی مانگ رہے تھے،
کبھی بھائی سے پیاس کی شکایت کر رہے تھے، کبھی پھوپھی کی چادر تھام کر پیاس کی شدت
سے بے چین ہو کر شکایتِ تشنہ لبی کر رہے تھے، کبھی عباسؑ کا دامن تھام کر پیاس کا
شکوہ کر رہے تھے اب اُن میں سے کسی بچے کی زبان پر پانی کا نام نہ تھا، کسی کے لب
پیاس کا شکوہ نہ تھا، کچھ مصائب کی تاب نہ لا کر دنیا سے گزر گئے تھے، کچھ بیہوش تھے،
ہوش میں تھے وہ بھی سہم کر خاموش ہو گئے تھے۔

یہ وہ سناٹا تھا جو موت کے بعد کا سناٹا تھا، جو موت سے بھی زیادہ مہیب

اور خوف ناک سناٹا تھا، جس سناٹے کو دیکھ کر موت بھی سناٹے میں آگئی تھی۔ بیبیوں کے پاس سر چھپانے کو نہ خیمہ تھا نہ چادر، مگر ہمّت اب اُن بیکسوں سے منہ چھپاتی پھر رہی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے موت کو بھی شکست دے دی تھی جس سے ہر طرح کی شکست نے بھی ہار مان لی تھی۔

اس دل کو ہلا دینے والے سناٹے میں ایک زینبؑ تھیں جو سب کی خبرگیری کر رہی تھیں اور مصائب پر بار بار سجدہ کرتی جا رہی تھیں۔ زینبؑ کے اصرار پر زمینِ گرم پر ہی بیبیاں اپنے بچّوں کو سینے پر لٹا کر لیٹ گئی تھیں۔ عباسؑ کے بجائے زینب پہرہ دے رہی تھیں۔ نگاہِ زینبؑ نے دور سے ایک سوار کو آتے دیکھا، بڑھ کر روکنا چاہا کہ آنے والے سوار چہرے سے نقاب اُلٹی اور فرمایا:

"بیٹی! علیؑ تیری حفاظت کے لیے آیا ہے"۔

جناب زینبؑ "بابا"، کہہ کر قدموں سے لپٹ گئیں۔

عزادارانِ حسینؑ! تصوّر کیجیے۔ جب زینب نے باپ کو دیکھا ہوگا تو کس قدر فریاد کر کے شکوہ کیا ہوگا؟۔ کہا ہوگا:

بابا! میں برباد ہوگئی، میرے پالے ہوئے سب قتل کر دیے گئے۔ بابا! آپ اُس وقت کہاں تھے، جب شمر میرے بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا۔ بابا! آپ اُس وقت کہاں تھے، جب میرے بھائی کے ہاتھوں پر ششماہے کا گلا تیر سے چھیدا گیا، علی اکبرؑ کے سینہ پر برچھی لگی، قاسم کا لاشہ پائمال ہوا۔

بابا! آپ اُس وقت نہیں آئے جب بھائی عباسؑ نے آپ کو پکارا تھا۔ بابا! آپ اُس وقت آجاتے تو میری چادر نہ چھینی جاتی ۔ بابا! میں فریاد کر رہی

تھی لیکن خیموں کے جلتے وقت کوئی مدد تک کرنے والا نہیں تھا۔ بابا! آپ اب آئے ہیں جب گھر لُٹ چکا ہے، سب قتل ہو چکے۔

عزادارانِ حسینؑ! زینب کے بین سے تمام اہلِ حرم گریہ کُناں تھے، ایک کہرام برپا تھا۔